مخزن

نیشن اور ہمزبانی

مندرجہ ذیل مضمون ایک اہم معاملے کے متعلق ہے - جو سب ابنائے وطن کی کامل توجہ کا محتاج ہے - اور ہمارے ایک قابل دوست شیخ حبیب احمد صاحب کے قلم سے نکلا ہے - جو ایک عرصے سے یورپ میں مقیم ہیں اور جو اثر انگلستان میں لوگوں کی ہمزبانی اور لباس میں یکرنگی سے پیدا ہوا ہے - اس سے بخوبی واقف ہیں - یہاں آنے سے پہلے انہیں ہندوستان کی اخباری دُنیا سے گہرا تعلق تھا - ایک زمانہ ہوا میرٹھ سے ایک اخبار پولیس نیوز نکلتا تھا - جس نے محکمہ پولیس میں بہت اعتبار پیدا کیا تھا وُہ شیخ صاحب موصوف ہی کا تھا اور اس کے بعد دہلی میں روزانہ اخبار انہی کے ہاتھ میں رہا - ایک عرصے سے شیخ صاحب کو اُردو میں مضمون نگاری کا اتفاق نہیں ہوا کیونکہ وُہ انگریزی میں ایک ایسے علم کے متعلق تصنیف کے کام میں مشغول ہیں - جس سے یورپ آج تک بیخبر ہے اور جس کا مشرقی دنیا میں بھی اب دُھندلا سا سُراغ ملتا ہے - مگر ہمارے اصرار سے اُنہوں نے مخزن کے لئے یہ مضمون لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی :-

علم اور تہذیب کی ترقی جب کسی مُلک میں ایک خاص درجے تک پہنچ جاتی ہے وہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں اُن آرزوں کا پیدا ہو جانا ایک لازمی اَمر ہے جو چند سال سے ہندوستان میں اپنے ظہور کا اعلان ہر طور اور ترکیب سے کر رہی ہیں اور جن کا پُورا ہونا بلاشبہ اُس مُلک کے لئے دلیلِ سعادت ہے - مگر اِن کا حصُول ایک یا دس یا سو آدمیوں کی قوت یا حکمت پر منحصر نہیں -

منشی محبوب عالم -

خواہ وُہ کیسے ہی لائق اور قابل اور با اثر اور اُنکی کارروائیاں کیسی ہی باقاعدہ اور باترتیب ہوں۔ نہ ایک دو جماعتیں ہی کچھ کر سکتی ہیں اور نہ لاکھ دو لاکھ روپے سے کام نکل سکتا ہی۔ دُوسرے ملک والوں کی تائید سے بھی مطلب براری نہیں ہوتی۔ خواہ وُہ کیسے ہی با اقتدار ہوں۔ حتّٰی کہ قوم فرماں روا کے افراد۔

اس مہتم بالشان مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُس اتحادِ عام اور اتفاقِ کامل کی حاجت ہے جسکی تعریف کے لئے ایک عام فہم لفظ نیشن (قوم) کافی ہے۔ اوّل اس کے پیدا ہونے کی ضرورت ہی۔ اس امر کی تفصیل کی یہاں کوئی حاجت نہیں کہ ایک ملک کے رہنے والوں کا ایک بن جانا کن اُمور میں متحد اور متفق ہونے پر مبنی ہی۔ ہر ایک شخص اِس سے کم و بیش واقف ہی۔ لیکن ان اُمور میں اتفاق اور اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا جب تک بعض لوگوں کے قلب میں ایسی حرارت اور حرکت پیدا نہ ہو جائے جیسی کسی عاشقِ صادق کے دِل میں ظاہر ہو کر اس کو سوائے اپنے معشوق کے ہر ایک شے سے مستغنی مطلق اور بے پروائے محض بنا دیتی ہے۔ صرف ایک ہی تصویر سامنے رہجاتی ہے۔ دوسری سب چیزیں اسی ایک ہستی میں غائب ہو جاتی ہیں۔ وُہ اسی ایک کی ذات میں محو و مستغرق ہو جاتا ہی۔ یہی برگزیدہ افراد ہیں۔ جن کو مبدءِ فیاضی سے وُہ مادّہ کامل عطا ہوتا ہے اور جس کی ذات میں وُہ صفات ودیعت کی جاتی ہیں جو اُن کے دُوسرے ہمعصروں میں نہ پائی جائیں یا اُن سے کم ہوں۔ اُنہیں کو سردارانِ قوم کہتے ہیں اور یہی قوم کے سچّے عاشق کہلاتے ہیں۔ یہی گروہ نامدار ہے جسکی رائے کو تمام مُلک اپنا ہدایت نامہ بنا لیتا ہے اور ان کی پیروی جان و دل سے اختیار کر لیتا ہی۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو یقین کر لینا چاہئے کہ اس ملک کی تقدیر جاگنے کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ اور اس کی پُوری ترقّی کے سامان مہیا ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کی اسوقت ایسی ہی حالت ہی۔ علم و تہذیب میں روز افزوں ترقّی ہو رہی ہی اور ایک عرصے سے وُہ مبارک جماعتیں اور افراد جو واقعی قوم کے جان نثار ہُوا کرتے ہیں پیدا ہو گئے ہیں اور شب و روز مُلک کی بہبودی کی فکر ہر طرح سے اپنی اپنی بساط کے موافق کر رہے ہیں۔ مگر افسوس کی

بات ہے کہ ان میں باہم وُہ اتفاق و اتحاد ابھی تک پیدا نہیں ہُوا - جس کو قوم کی رُوح کہہ سکیں تاہم اس میں اُن کی بھی چنداں خطا نہیں - کچھ ایسے واقعات سدِ راہ ہو رہے ہیں جن کا رفع کرنا بڑا مشکل کام ہے - وُہی امور جن میں اتحاد ہونا چاہیئے تھا اختلاف پیدا کر رہے ہیں - یعنی اختلافِ مذہب و زبان - حالانکہ اغراض عموماً مشترک ہیں -

مذہب بڑی چیز ہے اور اس سے زیادہ کوئی شے اہلِ ہند کو عزیز نہیں ہو سکتی - اِس کی نسبت تو گفتگو کرنا ہی محض فعلِ عبث اور تضیعِ اوقات ہے - اس کا فیصلہ تو اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دُوسرے کے عقائد کی عزّت کریں اور کسی طرح ایک دُوسرے کے مذہبی خیالات کو قولاً یا فعلاً ہرگز ہرگز کوئی صدمہ نہ پہنچائیں بلکہ ادائے رسومِ مذہبی میں ایک دُوسرے کو ہر طرح مدد دیا کریں اور جہاں تک ہو سکے کوئی دقتیں یا پیچیدگیاں پیدا نہ ہونے دیں - نہ کسی کی دِل آزاری ہو نہ دِل آزردگی - مگر دُوسری شَے - جو اتفاق و اتحاد کا جزوِ اعظم ہے وُہ زبان کا ایک ہونا ہے - اِس کے ذریعے سے ہم اپنے خیالات ایک دُوسرے پر اچھی طرح ظاہر کر سکتے ہیں - اِسی سے ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے جو کسی وقت قومی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں جان و رُوح کا کام دیگی - متفق ہو کر جو کام نکل سکتا ہے اس کی قدر سب کو معلوم ہے -

اِس وقت ہندوستان میں بہت سی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں - پنجابی کی بات مدراسی نہیں سمجھ سکتا - بنگالی گفتگو کرے تو گجراتی مُنہ تکتا ہے - میانِ دوآب کا رہنے والا مرہٹی کا ایک لفظ نہیں جانتا - پھر بتایئے کہ اِن کے خیالات ایک دُوسرے کو کیونکر متاثر کر سکتے ہیں - ایک کے دِل کی بات دُوسرا کیونکر جان سکتا ہے - ہم زبان نہ ہونے کی وجہ سے باہم وہ میل جول نہیں ہو سکتا جو عاقبتاً قوم کے متفرق اجزا کو جمع کر دیتا ہے - پس ہم کو سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ کل ملک کے لیئے ایک قومی زبان اختیار کریں - ہندوستان کی کل مروجہ زبانوں میں سے ایک کو یہ عزّت دیں کہ جس پر کثرتِ رائے متفق ہو جائے - اسی کو قومی زبان مان لیں - اِس سے یہ لازم نہ آئیگا کہ ہم اپنے گھروں میں بھی وُہی زبان بولا کریں - ممالک برطانیہ عظمیٰ میں آئرلینڈ والے کی اندرونی زبان

سکاٹ لینڈ کے باشندوں سے بالکل مختلف۔ ویلز والوں کے الفاظ اور محاورات انگریزی آئرش اور سکاچ سب سے علیحدہ۔ مگر قومی زبان سب کی ایک ہی یعنے انگریزی۔ اسی میں لکھتے پڑھتے ہیں۔ اسی میں علوم حاصل کرتے ہیں۔ یہی دفاتر کے کام میں آتی ہے۔ سرکاری ہوں یا تجارتی۔ اختلافِ مذاہب ان ملکوں میں بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ ہندوستان میں ہے مگر زبان کے معاملے میں نہ کوئی تکرار ہے نہ فساد۔ قومی معاملات میں مذہب کا مطلق امتیاز نہیں۔ وہ معاملہ ہی دوسرا ہے۔ قومی فوایداور برکتوں سے ہر ایک یکساں مستفید و متمتع ہوتا ہے کیا آئرش اور کیا انگریز۔ کیا سکاٹ لینڈ کا رہنے والا کیا ویلز کا باشندہ ہندوستان کے لئے بھی اسی طرح ایک عام قومی زبان قرار دے لی جائے اور اسی کے لحاظ سے ایک رسم خط بھی مقرر کر لیا جائے۔ اس کے قبول کرنے سے کسی کو کوئی مذہبی نقصان نہیں پہنچتا اور ایک بڑا مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔ ہم یہاں کسی خاص مروجہ زبان یا رسم خط کی خصوصیت کرنا نہیں چاہتے۔ اس کو کثرتِ رائے سے طے کرانا چاہیئے۔ ہندوستان میں دو ہی بڑے مذہب ہیں باقی انہیں کی شاخیں ہیں۔ عیسائی یا دیگر مذاہب کے پیروؤں کی تعداد بلحاظ قوم ہونے کے بہت ہی کم ہے اور وہ ایسے ہیں کہ ان کے عقائد پر کسی خاص زبان یا لغات کا کوئی اثر نہیں۔ جو کچھ دو بڑے گروہ یعنے ہندو و مسلمان مل کر باہم طے کرینگے اُن کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ تاہم ان کی رائے کو بھی شریک کر لینا چاہیئے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ انگریزوں میں باوجود اختلافِ مذاہب کے (عیسائی اور اُن کے بیشمار فرقے۔ یہودی۔ لامذہب وہریئے۔ یونی ٹیرین یعنی موحدین وغیرہ) زبان کی نسبت کوئی جھگڑا نہیں کرتے۔ عبادت کے لئے عیسائی بالعموم انگریزی زبان سے کام لیتے ہیں مگر رومن کیتھلک فرقے میں اس غرض کے لئے لاطینی مروج ہے۔ اور یہودیوں میں عبرانی۔ مگر ملکی اور قومی اغراض کے لئے صرف ایک زبان ہے۔ یعنی انگریزی اور اس ملک کے رہنے والے اس پر بلالحاظِ ملت و مذہب فخر کرتے ہیں۔ کبھی انکو خیال تک بھی نہیں آتا کہ جو زبان گرجے میں بولی جاتی ہے وہی شراب خانوں اور رذیل تین مقامات میں استعمال ہوتی ہے۔ اسی میں قانون کی کتابیں اور کلامِ الٰہی کی تفسیرات لکھی جاتی ہیں۔ اسی میں

مخالفین مذاہب کی حقیقت کے خلاف بحث اور اُن کی تردید میں کتابیں اور رسالے شائع کرتی ہیں۔

غرضکہ ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان میں ایک قومی زبان کل ملک کے مقرر کر لینے میں کسی کو کیوں عذر ہونا چاہیئے۔ کوئی نئی زبان اختراع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت جو زبانیں رائج ہیں اُن میں سے ایک پر ہم کو متفق ہونا چاہیئے۔ وُہ اگر کسی قدر ناکافی سمجھی جائے تو اس میں دُوسری زبانوں سے مدد لے سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ناقص ہونے کا عیب بھی نکل جائیگا۔ مگر ہم کو اس کے لئے آج ہی سے کوشش شروع کر دینی چاہیئے۔ تکمیل جب کبھی ہو۔ دُنیا میں یہی قاعدہ چلا آیا ہے۔

انگریزی جو ہمارے فرماں روائے قوم کی زبان ہی وُہ کل ملک کی زبان تو دو سو برس میں بھی نہیں ہو سکتی مگر اس کے اثر سے بھی نہیں بچ سکتے اور نہ بچنے کی کوئی ضرورت ہی۔ اس کے الفاظ کی آمیزش ہماری زبان میں اب بھی ہو گئی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہیگی مگر بے ضرورت لفظوں کے لینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس کی احتیاط کرنی چاہیئے۔ جن الفاظ کے بغیر ہم اپنا مطلب ادا نہ کر سکیں یا جو زیادہ معنی خیز ہوں انکو شوق سے قبول کریں۔

زبان کے ایک ہونے کی ضرورت کے تسلیم کرنے میں تو شاید کسی کو اختلاف نہ ہو مگر اس میں ضرور بحث ہو گی کہ کونسی زبان پر متفق ہونا چاہیئے۔ اِس مسئلہ پر غور کرنے کے وقت شاید یہ باتیں خیال کے قابل ہوں (اوّل) کونسی زبان ایسی ہی جو آسانی سے ہندوستان کے سب حصوں میں پھیل سکتی ہی۔ کون سی زبان ہی جس میں ہر ایک حصہ ملک کا حصہ شامل کر لیا جائے تو اُس کی خوبی اور عام فہم ہونے میں فرق نہ آئے۔ ثقیل اور اجنبی بھی معلوم نہ ہو۔ جہاں تک ہو سکے سہل ہو اور اس کے لکھنے پڑھنے میں بھی ایسی ہی سہولت باقی رہے جیسی کہ اُس کے بولنے میں ہو۔ ابھی تک ہندوستان کی مروجہ زبانوں کا دائرہ بہت ہی تنگ ہی۔ جہاں ذرا سی آمیزش کسی دُوسرے حصۂ ملک کی زبان کی ہوئی کہ اُسکو وُہ لوگ جو اپنے زعم میں اہل زبان ہیں فوراً مخلوط اور خلافِ محاورہ بتانے لگتے ہیں۔ کہدیتے ہیں کہ یہ خالص نہیں۔ اِس کے معنے گویا یہ

ہیں کہ ہم اپنی زبان کو محدود رکھیں۔ اس کو بڑھانا یا ترقی دینا گناہ ہی۔ مگر عاقبت اندیش اور ملک کی اصلاح اور فلاح چاہنے والے ان باتوں پر مطلق توجہ نہیں کیا کرتے۔ ہم کو اپنے محبوب کی آرائش وآسائش کے سامان جمع کرنے میں متفق ہونا چاہیئے۔ یہی وُہ محبت ہی جس میں رشک و رقابت کا پتہ نہیں۔ یہی وُہ معشوق ہی جس کے حضور میں حریف شیر و شکر بنجاتے ہیں۔ جتنا کوئی اس کو پیار کرے اتنی ہی آپس میں محبت بڑھتی جاتی ہی بخلاف شخصی عشق و محبت کے جس میں حریف سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دشمن ہی نہیں۔ غرض تو دونوں میں ہی مگر ایک کی غرض اپنی ذات تک محدود ہی۔ دوسرا قوم کے کل مجموعہ پر مفتون ہی۔ اور چاہتا ہے کہ ہر کوئی یکساں منتفع اور متمتع ہو۔ قومی فائیدوں کے سامنے ذاتی منفعتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافات اور ذاتی خواہشوں کو اس محبوب کے واسطے نثار کر دینا پڑتا ہے۔ زبان کے ایک بنانے اور اس کی اصلاحیں کرنے میں تو شاید بہت سی تکلیفیں برداشت کرنے کی نوبت بھی نہ آئے اور آئے بھی تو اُن بے انتہا فوایدکے مقابلے میں جو ایک ملک کے رہنے والوں کو ایک قوم بن جانے سے حاصل ہوتے ہیں ان کی حقیقت ہی کیا ہی ہمت شرط ہی۔ آنکھ کھول کر دیکھ لیجئے کہ ہمزبان ہونے کا اثر پچھلی قوموں پر کیا ہوا ہی اور آج کیا ہو رہا ہے۔ اس معاملے میں جہاں تک غور و فکر کیا جاتا ہے سوائے اِس کے اور نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہمزبانی ہمقوم ہونے کی ترکیب میں جزوِ اعظم ہے +

حبیب احمد (از لنڈن)

دربار نمبر ۔ جو دسمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس کے مضامین بجائے ۵۶ کے ۹۶ صفحہ پر آئے تھے اور انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ اسکی کچھ زاید کاپیاں رکھی ہیں۔ جن حضرات کو شوق ہو طلب فرمائیں۔ اس میں کئی نظمیں مستقل قدر کے قابل ہیں۔ قیمت ۶ر بذریعہ رجسٹرڈ ٹکٹ ہائے ڈاک یا وی۔ پی طلب کیجئے۔ **مینیجر مخزن۔ لاہور**

ڈالی

(سلسلے کے لئے دسمبر ۱۹۰۴ء کا نمبر ملاحظہ ہو)

ڈالی کے نام اور لباس میں تبدیلی کی ایک دو اور بلاغت بھی ہوئے۔ شروع میں طاقتِ ملکی ایک بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ جس کو تحفہ تحائف دیئے جاتے تھے۔ لیکن طاقتِ ملکی کے وسیع ہو جانے پر جب یہ ناممکن ہو گیا کہ ایک واحد شخص جملہ طاقت کا استعمال خود کرے۔ تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ماتحتوں میں سے بعض سرکردہ اشخاص کو منتخب کر کے مختلف اختیارات و فرائض منصبی اُن کے تفویض کئے جائیں۔ اِن دستور نے ماتحت افسروں کے اختیارات کا دائرہ وسیع کر دیا اور چونکہ کسی پر مہربانی کرنا یا کسی کو کوئی خاص رعایت دیدینا اُن کے اختیار میں آگیا۔ اسواسطے لوگوں کو مثل بادشاہ کے حکامِ ماتحت کی دلجوئی اور خاطر داری مطلوب ہوئی۔ تحفہ تحائف علاوہ حاکم اعلیٰ کے حکامِ ادنیٰ کو دیئے جانے جاری ہوئے۔ خصوصاً جبکہ شروع میں حکامِ ادنیٰ کی تنخواہ کارکردگی سرکار سے مقرر نہ تھی۔ اور عامل کے تحفہ تحائف ہی وسیلۂ آمدنی تھے۔ جب طاقتِ ملکی ماتحتوں پر منقسم ہوئی۔ اسوقت بادشاہ کی طرف سے معاوضۂ خدمات ادا کرنے کی رسم نہ تھی۔ یہ ایک مابعد کا قصہ اور پیچھے کا خیال ہے۔ شروع میں بلکہ ماتحت سے بادشاہ کچھ بطور باج یا خراج کے لیتے تھے نہ بجائے اس کے کہ شاہی خزانے سے کچھ اسکو دیویں۔ گورنر یا صوبے کے حاکموں۔ یا ضلع داروں کے لئے اختیارات تفویض شدہ کا قبول کرنا باعثِ اعزاز و فخر سمجھا جاتا تھا۔ اور اظہارِ اطاعت کے ساتھ ہی وسیلہ آمدنی ذاتی تنخواہ کا کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ برعکس اس کے ماتحت استعمال اختیارات عطا شدہ سے خود جو آمدنی پیدا کرتا تھا۔ اس کے ایک جزو یا ایک رقم یعنی بطور خراج اعلیٰ حاکم کو دی جانی مقرر ہوتی تھی۔ اِس سے زیادہ جب خراج یا باج ایک فرض اور ذمہ واری ہو گئی۔ تو بادشاہ کی خصوصیت سے رضاجوئی کے لئے علاوہ مقررہ خراج کے بیش قیمت تحفہ تحائف ہر قسم مثلاً ہاتھی۔ گھوڑے۔ سونے چاندی کے برتن

زیور وغیرہ بطور اظہار مطابعت بھی جاری ہو گئے۔ لیکن بادشاہ کی طرف سے اگرچہ بعض اوقات بطور اظہار خوشنودی کچھ عطیہ دیا جاتا تھا۔ مگر وُہ تنخواہ یا معاوضہ کارکردگی نہ ہوتا تھا۔ مغلیہ بادشاہان کے وقت صوبہ بنگال و دیگر سرداران کی آجکل کے گورنر و لفٹنٹ گورنروں کی طرح تنخواہ ماہانہ یا سالانہ مقرر نہ تھی۔ حکام مقررہ شدہ کو آزادی تھی کہ اختیارات تفویض شدہ برتیں اور جن کے حق میں وُہ اختیارات استعمال ہوں۔ اُن سے آزادی کے ساتھ معاوضہ لیویں۔ دُوسرے الفاظ میں رشوت لوٹ گھسوٹ کے ذریعے سے خواہ کچھ پیدا کریں۔ بادشاہ کو حصّہ آمدنی یعنی مقررہ خراج اور اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً خاص تحائف دیدیویں۔ اطاعت و وفاداری کا اظہار اس طریق سے کریں گو اندرونی معاملات میں پُورے طور پر خود مختار ہیں۔

تمدّن جب ترقی کر جاتا ہے تو یہ حالت تبدیل ہو جاتی ہے اور وُہ صُورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو یورپ و دیگر ترقی شدہ مہذّب ممالک میں دیکھی جاتی ہے۔ اور جس کا پھل ہم کو بھی بوجہ برکات سلطنتِ انگریزی حاصل ہو رہا ہے۔ یعنی جو حکام سرکاری طور پر ضرورتِ انتظامِ ملکی کی وجہ سے مقرر ہیں۔ ان کو سرکار خزانے سے معاوضہ اُن خدمات کا دیتی ہے۔ اور رعیت سے صرف مقررہ ٹیکس وغیرہ لے لیتی ہے۔ حاکموں اور افسروں کے لئے بنج کے طور پر کوئی معاوضہ فرائض منصبی کے انجام دہی کا لینا۔ یا کچھ معاوضہ کسی قسم کا لیکر فرائضِ منصبی کی سرانجامی میں کسی کے ساتھ رعایت کرنا۔ رشوت کے نام سے موسوم ہو کر جُرم قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو شخص اس قسم کا معاوضہ دیوے اسکو بھی شریک جُرم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ڈالی رشوت کے طور پر قائم رہے اور لوگ منفعتِ ذاتی کے اغراض سے خفیہ طور پر نقدی یا مال حکّام کو دیں۔ یا افسر ذاتی لالچ اور بے ایمانی سے ناجائز معاوضہ خدماتِ منصبی کا لیں تو بادشاہ کا قصور نہیں بلکہ رعایا کا یعنے رعایا کے ایک حصّے کا جو رشوت دیتا ہے۔ اور اس کے دوسرے حصّے کا جو رشوت دیتا ہے۔ رشوت کی حالت چونکہ سلسلے میں تنخواہ سے پہلے۔ اور تنخواہ کے مقرر ہونے کے بعد بھی موجود ہوتی ہے۔ اس لئے بعض لوگ جو اِس ارتقار پر پُورا غور نہیں کرتے۔ وُہ تنخواہ کی حالت کے بعد رشوت کو موجود دیکھ کر۔ اور پیشتر کی حالت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے رشوت کو اعلیٰ حالت سے تنزّل

کی حالت بیان کرنے لگ جاتے ہیں - حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ یہ تمدن کی ایک ادنیٰ حالت کا بقیہ ہے جو اعلیٰ حالت میں بھی موجود ہو - یہ تنزل کی علامت نہیں ہو - بلکہ اس کا وجود اس بات کا ثبوت ہی کہ ترقی کی حالت میں پُرانی ناقص حالت کے نشانات ابھی کلی طور پر معدوم نہیں ہوئے -

آخر میں جب رشوت کا صحیح طور پر لیا جانا - یا دیا جانا داخلِ جرائم ہو جاتا ہو - تو ڈالی کی شکل میں بڑی بھاری تبدیلی واقع ہوتی ہو - اس میں علاوہ اپنے ذاتی خاصے کے جس سے محض حصولِ خوشنودی مطلوب ہوتا ہو - فرضی یا نمائشی طور پر افعالِ محبت کا خاصہ بھی مختلف ہو جاتا ہو - موجودہ ضرورت کا خیال تو چنداں نہیں ہوتا - ہاں آیندہ ضروریات کا خیال کر کے اور یہ دیکھ کر کہ فلاں شخص کے اختیار میں میری نسبت کچھ احکام صادر کرنا ہو - بطورِ اظہار دوستی اطاعت آمیز کے کچھ تحفہ دیدیا جاتا ہو مُدعا ڈالی کے صاف طور پر دو ہوتے ہیں - ایک تو لینے والے کی طبیعت خوش کی جاتی ہو - اور اس میں ایک دوستانہ خیال جو آیندہ مفید پڑتا ہو پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہو - دُوسرا جو کہ اس فعل سے مقصود رضاجوئی ہوتا ہو اور ساتھ ہی اظہارِ مطابعت - دُوسرے کی طبیعت میں ایک قسم کی شفقت آمیز حکومت کا سرور پیدا کیا جاتا ہو - ڈالی لینے کے بعد نگاہوں کا عتاب یا رعب شفقت اور تلطف سے متبدل ہو جاتا ہو - جس سے ڈالی دینے والے کو آیندہ فوائد کی اُمید بندھ جاتی ہو - چونکہ ڈالی سے تعلقاتِ دوستانہ کا اظہار مقصود ہوتا ہو - اور یہ کسی خاص غرض پر محمول نہیں ہوتی - اس لئے دوستانہ طور پر اسے قبول کیا جاتا ہو - اور قانونی گرفت کا بھی کوئی خیال نہیں ہوتا - موجودہ شکل میں یہ رسم پوری آزادی کے ساتھ قائم ہے - تاہم گورنمنٹ نے مصلحتاً دو طریق سے اسکو محدود کرنا مناسب سمجھا ہے - اوّل ماتحتوں سے ڈالی لینے کی ممانعت کر دی ہو - دوم خاص قیمت سے زیادہ کی ڈالی روک دی ہے - لیکن ڈالی اس محدود شکل میں پورے طور پر مروج ہو - اور اسکو معیوب نہیں سمجھا جاتا - خوف ہو تو صرف یہ کہ کہیں جس طرح سے پہلے طریق حصولِ خوشنودی عام ہو کر غیر لازمی سے لازمی ہو گئے - اور رواج یا قانون بن گئے - یہ بھی ایک تمدنی قانون نہ بن جائے - اور جو شخص کسی افسر کو سلام کرنے وقت ڈالی پیش نہ کرے وہ موردِ عتاب نہ سمجھا جاوے -

اس بیان سے ا۔ "یہ پایا گیا کہ ڈالی نے وقتاً فوقتاً خاص خاص اسباب کے اثر سے خاص خاص صورتیں اختیار کی ہیں"۔ یعنی شخص غالب کے خوف سے اور مصلحتاً اسکو خوش کرنے کی نیت سے خود بخود تحفہ تحائف کا دیا جانا شروع ہوا۔ بعد ازاں بادشاہ کے لئے تحفہ تحائف لازمی ہو گئے اور ٹیکس اور مالگذاری وغیرہ کی شکل میں بادشاہ کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بنگئے۔ اس کے بعد خصوصیت سے بادشاہ کو راضی رکھنے کی غرض سے بہ وقت ملاقات نذر نذرانہ پیش کرنے کی رسم پیدا ہوئی۔ جس سے اصل مطلب ڈالی کا فوت ہو گیا۔ پھر خاص امداد شاہی کے حصول کی غرض سے خاص فیس۔ بعد ازاں مقررہ فیس یعنی رسوم عدالت وغیرہ کا دیا جانا شروع ہوا۔ ادنیٰ حکام کی صورت میں بھی نذر نذرانہ کی رسم جاری ہو گئی جب ایک شخص مطلق العنان کے اختیارات دیگر افراد پر منقسم کئے گئے۔ اور چونکہ شروع میں تنخواہ ملازمان سرکاری ذمہ سرکار نہ ہوتی تھی۔ رشوت کا رواج تقویت پکڑ گیا۔ تنخواہ مقرر ہونے پر بھی ادنیٰ حالت کی رسم رشوت قائم رہی۔ اس کے بعد چونکہ بظاہر خود غرضانہ نیت سے تحفہ دینا جرم ہو گیا۔ اس لئے دوستانہ طور پر ڈالی دیا جانا مروج ہوا۔

ب۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ حقوق شاہی مستقل طور پر قائم ہو جانے کے بعد بھی شروع میں کوئی قانون یا خاص حکم نہ تھا جس کی تعمیل میں بادشاہ کی مطابقت دکھلائی جاوے۔ صرف بادشاہ کے خوش کرنے میں اور خود بخود تحفہ دینے میں یعنی بیرونی علامت اطاعت متصور تھی۔ بادشاہ کی مطلق العنان و غیر معین خواہش ہوتی تھی جس کو پورا کرنا ہی داخل فرمانبرداری تھا۔ بعد ازاں ترقی شدہ حالت میں قوانین بن گئے۔ ہر ایک کی ذات و جائداد محفوظ کی گئی۔ اور بادشاہ کی حکومت کے برخلاف کوئی فعل کرنا۔ یا کسی دوسرے شخص ماتحت کو ضرر یا نقصان پہنچانا جرم ہو گیا۔ بادشاہ کا حق صرف جزو جائداد رعایا پر قائم کیا گیا۔ اور اس طریق مطابعت کے علاوہ اگرچہ کوئی فرض یا ذمہ واری نہیں تھی کہ بادشاہ خوش کیا جاوے۔ تاہم آغاز رسومات کا ہو گیا۔ جن سے بیرونی علامت کے طور پر اظہار اطاعت مطلوب تھا۔ قانون نے اس قدر ترقی کی کہ خود بادشاہ تابع قانون ہوا۔ یہ سب سے اعلیٰ و آخری حالت اسکاٹری آف سٹیٹ پر نالش ہو سکے۔ یا زور حکومت کو ترک کر کے ایک ماتحت سائل کی طرح

اصولِ انصاف وقانون کے مطابق اپنی عدالتوں سے سرکار خود استدعائے حق کرے۔ سکول ایبٹ آباد
کے متعلق سرکار کا خود مدعی بنکر رعایا پر دعویٰ کرنا۔ اور فیصلہ خلافِ سرکار ہونا۔ اور اس قسم کے بہت سے نظائر نہایت حیرت انگیز ہونگے۔ اُن اشخاص کے لئے جو اس خیال سے واقف نہ ہو گئے ہوں۔ لیکن گو اس ترقی شدہ حالت میں قانون کی پابندی۔ احکامِ شاہی کی تعمیل ہی اصل مطابقت سمجھی گئی اور مستقل طریقِ عمل قائم ہوگیا جس سے بادشاہ کی خوشنودی حاصل ہو سکے۔ تاہم سابقہ ادنیٰ حالت کی رسومات اور اُس زمانہ کے خیالات (کہ ڈالی اور تحفہ تحائف ہی سے حاکم کی خوشنودی ہوسکتی ہی) کو بھی ساتھ ہی چسپاں رکھا گیا۔ اگرچہ ضروری اور غیر ضروری مطابقت میں امتیاز ضرور کیا گیا۔ بعض اشخاص صرف ضروری مطابقت یعنی پابندی قانون کو ہی مدنظر رکھتے ہیں۔ زیادہ تر اشخاص غیر ضروری مطابقت یعنی فالتو رسومات ڈالی وغیرہ کو بھی ویسا ہی مقدم جانکر جاری رکھتے ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے ڈالی کی مختلف صورتوں یعنی ارتقاء پر بحث کی ہے اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ سوسائٹی کی ملکی حالت کی طرح مذہبی حالت میں بھی یہی اصُول ارتقاء عمل کرتا رہا ہے جسکی وجہ سے بعض ابتدائی خیال تبدیل ہوتے ہوتے عقاید مذہبی بن گئے ہیں۔

آغاز تمدن میں عام عقیدہ تھا کہ ہر ایک انسان میں ایک دوسرا مثنیٰ ہے جو بحالتِ زندگی موجود ہوتا ہی۔ اور بحالتِ موت نکل جاتا ہی یا علیحدہ ہو جاتا ہی۔ خواب کی لوگ اس طرح تعبیر کیا کرتے تھے کہ جب بیرونی جسم بے حس و حرکت ہوکر رات کو ایک جگہ پڑہ رہتا ہی مثنیٰ جسم سے نکل کر ہر ایک جگہ کی سیر کرتا پھرتا ہی اور مختلف نظارے دیکھ کر صبح اپنے صدر مقام یعنی جسمِ کثیف میں آ موجود ہوتا ہے۔

اس مثنیٰ میں ہر قسم کی خواہش نفسانی کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا۔ انسان قدیم کے نزدیک ان دونوں میں فرق صرف یہی تھا کہ انسان کا ظاہری بدن کثیف ہی۔ اور مثنیٰ کا بدن غیر ہے۔ جس طرح ہوا کی موجودگی ہوا کے چلنے اور طبعی دنیا میں اثر ڈالنے سے ثابت ہوتی ہی۔ اسی طرح سے زندہ اشخاص پر بیماری۔ تکلیف۔ خوشی وغیرہ مختلف آثار کے نمایاں ہونے سے غ

اس غیر مرئی مثنے کو قرار دیا جاتا تھا۔ خدا کا خیال یا دیوی یا دیوتا کا خیال انکی طاقتِ دماغی سے باہر تھا۔ وُہ ہر ایک رنج و راحت کو مردہ کے مثنے سے متعلق کرتے تھے۔ یہ عقیدہ آجکل بھی بہت سی وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے۔

اس مردے کے مثنے کی نسبت یقین تھا کہ نقصان و فواید زندہ انسانوں کو پہنچا سکتا ہی۔ اور ساتھ ہی اس میں انسانی جذبات اور خواہشیں موجود مانی جاتی تھیں۔ اِس لئے یہ عقیدہ تھا کہ مردے کے مثنے کو بھوک۔ پیاس لگتی ہی۔ سردی گرمی محسوس کرتا ہی اور خوش اور ناراض مثل انسان کے ہو سکتا ہی۔ اِس عقیدے کی وجہ سے مردے کے مثنے کی رضاجوئی شروع ہوئی۔ جس طرح کہ ملکی حالت میں شخص غالب کی رضاجوئی تحفہ تحائف سے شروع ہوئی تھی۔ اور اس کی علت غائی وہی مصلحت تھی کہ پیشتر اِس کے کہ یہ ناراض ہو کر نقصانِ مال یا نقصانِ جان پہنچاوے۔ خود بخود جزوِ جائداد یا کچھ جاندار شے دیکر اس کو راضی کر لیا جائے۔ سوسائٹی کی ادنیٰ حالت یعنی اس مصلحت آمیز خیال سے وُہ رسُوماتِ مرگ قائم ہوئیں۔ جن میں غذا اور لباس ۔۔ شخص مردہ کے لئے مہیا کئے جاتے تھے۔ آجکل بعض حبشی اقوام افریقہ اور ہندوستان کے بھیلوں۔ نتھالوں میں یہ رسُومات ہیں۔ اور اِنکی وجہ صاف طور پر مذکورہ بالا خیال معلوم ہوتا ہی۔ کیونکہ جن اقوام میں اب بھی یہ دستور باقی ہی۔ وُہ ساتھ ہی مُردہ کو غذا و لباس دیتے وقت اس طرح سے مخاطب ہوتی ہیں۔ کہ "اے مہربان بزرگ یہ غذا کھالو۔ پوشاک پہن لو۔ اور ہم پر نظرِ عنایت رکھو۔ جیسا کہ حالتِ زندگی میں رکھتے تھے"۔ ہمارے ہندوؤں میں پرانی قسم کے خیالات کے اشخاص میں یہ عقیدہ موجود ہی۔ رسُوم مذہبی مثلاً سرادھ۔ پنڈ۔ کریا۔ دھرم شانت وغیرہ کا اغاز اس ابتدائی خیال سے ہُوا۔ گو بعد میں ترقی شدہ حالت کے وقت۔ جب یہ خیال ابتدائی جاتا رہا۔ تو یہ رسُوم بطور افعالِ محبت قائم رہیں۔ مستورات سے اکثر سُننے میں آتا ہی کہ "ہے وڈ وڈیریو۔ ساڈی بھُل چُھت معاف کرو۔ (اے بزرگو! ہمارا کہا سُنا معاف کرو) جس سے صاف طور پر پایا جاتا ہی کہ بزرگوں کے مردے کے مثنے کی بابت اُن کا عقیدہ ہی کہ زندہ انسانوں کے ساتھ تعلق باقی رکھتا ہی۔ اور کہ اُن میں ناراض اور راضی ہونے کا مادہ موجود ہے۔

(باقی آئندہ)

موسیقی

موسیقی اور حُسن دو ایسی دلپذیر چیزیں ہیں کہ اگر جادو کا فعل (فی الواقع) صرف اپنے معمول کو مسخر کر لینا ہی ہوتا ہے - تو یہ دونو بلاشک جادو اور چلتا ہُوا جادو ہیں -

اِنسان جس طرح بالطبع حُسن پسند واقع ہوا ہی - موسیقی پسند بھی واقع ہوا ہی - اور ان دونوں کا طبیعتِ انسانی پر کم و بیش یکساں اثر ہوتا ہی - دونوں متحد الکیفیت ہیں - دونو دلگداز - دونوں رُوح پرور ہیں - دونوں جاں نواز - دونوں کی راہ میں شائبۂ آہ موجود ہی - اور (قطع نظر بعض مستثنیات) دونوں درد انجام ہیں -

چہ سب ظاہر موسیقی اور حُسن میں کچھ مماثلت و تعلّق معلوم نہیں ہوتا - یعنی ایک کو مطلق سامعہ سے واسطہ ہی - دوسرے کو مطلق باصرہ سے - ایک غیر مرئی شے ہی - دُوسری مرئی ہی اور مرئی بھی کیسی؟ یہ نہ بتایا جائیگا !! لیکن اگر بغور دیکھا جائے - تو دونو میں باہمد گر معنوی توافق و تناسب موجود ہے - حُسن - خاموش موسیقی (رنگینی) لئے ہُوئے ہی - اور موسیقی - حُسنِ مستور - جسکو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں - مگر کانوں کی راہ قلب پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہی - جو آنکھوں سے کسی حسین کو دیکھ کر -

دونوں میں دِل گدازی کی وُہ اعلیٰ صفت مضمر ہے - جو آدمی کو انسان اور انسان کو فوق الانسان بناتی ہی - دِل - گداز ہو کر ہی لذّتِ درد کا مزہ چکھ سکتا ہی - جس سے قلبِ انسان میں - صوفی صافی منش - اہلِ اللہ - اور خلیفۃ اللہ وغیرہ کا پورا مصداق بننے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہی - لذّتِ درد کیا شے ہے ؟ اُس کی کیفیت کوئی کسی اہلِ دل سے پُوچھے -

بس موسیقی اور حُسن وہ نسخۂ اکسیر ہیں - جو بے واسطہ دل کو گداز کر کے اُس میں درد پیدا کرتا ہی - اور دِل گداختہ ہی ہی - جو انسان کو مرتبۂ انسانیت سے بڑھا کر - ملکوتی صفات بنا سکتا ہی -

جس طرح اطبا نے امزجہ نباتات تشخیص کرکے اُن کے اثرات بالکیفیت والخاص علیحدہ علیحدہ بیان کئے ہیں۔ اسی طرح ماہران موسیقی نے ہر راگ اور راگنی کی جداگانہ طبیعت بیان کی ہیں۔ اور ان کا مزاجِ انسانی پر ایک حد تک طبی اثر پڑتا ہی۔ فوری خوشی۔ فوری جوش فوری جرأت۔ فوری اُمنگ۔ فوری ولولہ (اور بعض خاص صورتوں میں) فوری درد پیدا بلاشبہ طبی پہلو لئے ہوئے ہی۔ جس طرح بعض ادویات اگر انہیں ترکیب اور مقدار معینہ باقاعدہ طور پر بے کم و کاست استعمال کیا جائے۔ معدہ مریض میں پہنچتی ہی اپنا فوری اثر ظاہر اسی طرح اگر کوئی باخبر اور باصول گویا کوئی راگ یا راگنی اُس کے ہر ایک سُر پر نظر کرکے باقاعدہ صحیح طور سے گائے۔ تو ضرور اور فوراً اس کا اثر سامعین پر پڑیگا۔ اسی بنا پر میگھ کی چیز وا خود بخود ایسا محسوس ہوا کرتا ہی۔ کہ ان کو برسات سے کچھ مناسبت سی ہی۔ دیکھا گیا ہی کہ کے فوراً ہی بجے کوئی رام کلی یا پرج گانے لگا۔ الاپ کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا کہ گویا سپیدۂ سحر ہی اور مرغانِ خوش الحان مصروفِ نواسنجی و زمزمہ پیرائی۔ درباری کا دن میں کبھی وہ لطف نہ آیا۔ جو را وقت۔ وَقِسْ عَلٰی ھٰذَا۔ اسی کا نام ہی خاصیتِ مزاجی۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ رات کا دن میں اور دن کی رات کو کام نہیں دیسکتیں۔ نہیں لطف دیجاتی ہیں۔ مگر کیسا؟ جیسا بے فصل کا

بعضوں کا خیال ہی کہ جو لوگ فنِ موسیقی میں علم تامہ رکھتے ہیں۔ انہی کو صبح کی راگنی سے کو صبح کا سماں۔ اور میگھ کی چیزوں کو برسات سے مناسبت اور تعلق سا محسوس ہوسکتا ہی کو نہیں۔ اگر ناواقفوں سے اُنکی مراد جیوان ناطق ہی۔ یعنی جنہیں اچھی بُری چیز کا احساس و تمیز نہیں انکا خیال صحیح ہوسکتا ہی۔ ورنہ معلومات کو تاثرات میں کچھ دخل نہیں۔ ہم عطر کا بس ایک بھرے مجمع ہیں۔ عطر کی خوشبو سے ہر شخص کا دماغ طبلۂ عطار بن جاتا ہی۔ جو لوگ حنا۔ جوہی۔ کیوڑے۔ گ میں تمیز کر سکتے ہیں۔ لطفِ خوشبو انکو بھی اسی قدر حاصل ہوتا ہی۔ جتنا دوسروں کو۔ فرق اس قدر کہ وہ اس پہیلی کو بوجھ لیتے ہیں۔ اور یہ محظوظ ہوتے ہیں۔ مگر جس طرح گونگا گڑ کا کام ہوتا ہی۔ مگر بیان نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ اُن کیفیات کو تو بتا سکتے ہیں۔ مگر راگنی کا نام نہ

عطرِ خس جاڑے میں اور حنا برسات میں بے موسمی سے معلوم ہوا کرتے ہیں۔ مگر انکی طبیعت
ج میں کچھ فرق نہیں آتا۔ بعض حضرات موسیقی کو علیٰ حد ذاتہٖ موثّر نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ
ر سے دل متاثر ہوتا ہی۔ اسکا نام نازک آوازی اور خوش گلوئی ہی"۔ بے شک نازک آوازی بھی
د چیز ہے۔ مگر بلا موسیقیت۔ جسد بے روح۔ نری آ آ سے خاک اثر نہیں ہو سکتا۔ مثلاً
کے لئے نازک آوازی کو سونے پر سہاگہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر نازک آوازی محتاجِ موسیقی ہی اور
محتاجِ نازک آوازی نہیں۔

انسان تو بھلا اشرف المخلوقات ٹھہرا۔ ہر اچھّے بُرے کو بخوبی سوچ سمجھ سکتا ہی۔ موسیقی کے
ثر ہونیکا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہی۔ کہ حیوانات تک کو مسخر کر لیتی ہی۔ ذرا
کے نے ڈھنگے پن اور تن و توش پر نظر ڈالئے۔ اور ذرا سے بوجھ سے بلبلا اُٹھنے پر۔ عرب کے
ان۔ معمول سے منوں زیادہ بوجھ لاد کر۔ حدی خوانی شروع کرتے ہیں۔ اور ماشاءاللہ آپ
) عالمِ محویّت میں بے تکان۔ چپ چپاتے منزلیں کی منزلیں طے کر جاتے ہیں۔ آہوئے
رام کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہی کہ اُس پر بانسری کے ذریعے سے اثرِ موسیقی ڈال کر۔ از
د محو کر کے گرفتار کرتے ہیں۔ سانپ جیسا موذی جانور کہ انسان کے سائے سے بھاگے اور
ے تو فنا کر ڈالے۔ ابھی بانبی میں کُنڈلی مارے دُنیا و مافیہا سے بے خبر گوشۂ تنہائی کے
ٹ رہا تھا۔ جوں ہی سپیرے نے آکر بین بجائی۔ حضرت لہراتے ہوئے رونق افروز
ن ہُوئے۔ کون کھینچ لایا؟ حسنِ موسیقی۔ بچّے کو دیکھئے بے چارہ پنگھوڑے یا کھٹولے
لیسا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ابھی ماں نے ذرا تھپک کر اپنی لَے میں لوری دینا شروع
کیا۔ غرض یہ کہ موسیقی بذاتہٖ موثّر اور بجائے خود عملِ تسخیر ہے۔
موسیقی کو محض کھیل تماشا اور صرف وجہ تفریح قرار دے لینا سخت ناحق شناسی اور ناقدردانی
یں اس سے بہت سے علمی و قوائی فواید حاصل ہوتے ہیں۔ غور کی عادت۔ تفتیش کی قابلیت
ن رسائی۔ حافظے میں تیزی۔ دماغ میں مشقِ نکتہ رسی ممیزہ و مدرکہ میں قوّتِ تمیز و ادراک پیدا

ہوتی اور بڑھتی ہے اور انسان بال کی کھال نکالنے لگتا ہے۔ روح تازہ ہوتی ہے۔ طبیعت کی ماندگی اور کسل دُور ہوتی ہے۔ قلب میں فرحت اور مزاج میں شگفتگی آتی جاتی ہے۔ یکسوئی حاصل کرنے کا بہت اچھا آلہ ہے۔ جن مذاہب میں گانا داخلِ طریقِ عبادت ہے۔ اس کی فلاسفی کیا ہے؟ یہی۔ علم مسمریزم میں جو اسکو داخلِ اصول کیا گیا ہے۔ کیوں؟ اِس لئے کہ اس سے یکسوئی بھی حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال موسیقی ایک بکار آمد اور مفید شئے ہے۔ جس علمِ ریاضی کا ایک شعبہ کہہ سکتے ہیں۔ جس چیز میں اتنی خوبیاں ہوں بلاشبہ قابلِ قدر ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے۔ کہ اس کی کہاں تک قدر ہوئی۔ ہمیں زمانہ گذشتہ کی (اسلامی یا غیر اسلامی دُنیا) سے استدلال کرنے کی یہاں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اگر اس وقت بھی اس کی یہی گت ہوتی۔ جیسا کہ اب حالت کس مپرسی میں ہے۔ تو آج ہمیں لفظِ "موسیقی" کتابوں میں بھی بڑی تلاش سے ملتا۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ یہ فن بڑا لطیف اور بہت شریف فن تھا۔ حکماء کے گھر میں پیدا ہوا۔ انہی کی گود میں پرورش پائی۔ بڑھا۔ صلحا بھی محبت کی نظر سے دیکھنے لگے (اگرچہ زیادہ مُنہ نہ لگایا) علماء میں بھی بے وقعت نہ رہا۔ ترقی کی۔ اور دربارِ اُمراء و خلفاء تک رسائی ہوئی۔ سُوءِ اتفاق سے ایک ایسی نااہل قوم کے پلے بندھا۔ جو مُلک میں بلحاظ تمدن و معاشرت ادنیٰ ترین و ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ اُن کمینوں نے اسے اپنا وجہ معاش قرار دیکر اور صرف اپنی جائداد سمجھ کر خاص اپنی قوم میں محدود کر لیا۔ اور اس کی اشاعت میں اس قدر بخل روا رکھا کہ شاید کانشتی جی کے پنڈتوں نے تعلیم علم سنسکرت میں بھی اسقدر کنجوسی نہ برتی ہوگی۔ گویا طوطی را باز اغ و قفس کردند۔ جُوں جُوں زمانہ گذرتا گیا۔ وُوں وُوں یہ اعلیٰ سوسائٹی سے دُور ہوتا گیا۔ شرفاء سنجباء بہ نظرِ حقارت دیکھنے لگے۔ اور کمینوں سے اس کی خصوصیت و اتحاد بڑھتا گیا۔ "صحبتِ صالح ترا صالح کند" کی ذیل میں آگیا۔ ان کمینوں کی نسبت سے لوگ اِسے بھی کمینہ سمجھنے لگے۔ اور اُن نالائقوں نے اُسے ایسی بدذوقی اور بے احتیاطی سے استعمال کیا۔ کہ لحن داؤدی کی سی نایاب شئے بھی ممنوعات شرعی میں داخل ہوگئی۔ ایسی حالت میں یہ فن کیوں نہ نیچا دیکھتا۔ نیچا دیکھا اور ایسا۔ کہ آج اس قوم میں بھی فی صدی ایک آدھ شخص ہی ایسا مل سکتا ہے۔ جو اس کے اصُول و قواعد سے کما حقہ باخبر ہو!!!

(باقی آئندہ)

خوشی کی بات ہی کہ آج کل اعلیٰ طبقے کے لوگوں اور مہذب جلسوں میں باجوں گاجوں کے توسّل اور معرفت سی اسکی آؤ بھگت ہونے لگی ہی۔ اگر اب بھی اس کی حفاظت نہ ہُوئی اور اس پر توجہ نہ کی گئی تو وُہ زمانہ دُور نہیں کہ بعض قوموں کی طرح روئے زمین پر اس کا بھی نشان نہ ملیگا +

سیّد علمدار حسین

اِس دفعہ جو دو تصویریں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں وُہ دو ایسے مشاہیر کی ہیں جو اپنے اپنے طبقے میں نہایت ممتاز ہیں :—

خان بہادر مولانا سیّد علی محمّد صاحب رئیسِ عظیم آباد مدّ ظلّہ العالی کی زیارت کے ناظرین بیتابی کے ساتھ منتظر ہونگے۔ آج ہم اس تصویر کو شائع کرکے اُن کے دیدۂ مشتاق کو نورانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیئے دیکھئے یہ ہیں وُہ بزرگ جن کی کلام کو پڑھ پڑھ کر آپ سر دُھنتے رہے ہیں جن کے مضامین کی پاکیزگی خیالات کی نفاست زبان کی سلاست بیان کی متانت بندشوں کے بیساختہ پن اور اُستادانہ قادرالکلامی کے آپ قائل ہو چکے ہیں۔ آیئے اور انکی زیارت کیجئے۔ ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے +

منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر و مالک پیسہ اخبار لاہور — کے مضامین سے مخزن کے صفحات ایک آدھ دفعہ زینت حاصل کر چکے ہیں اُردو اخبار نویسی کی جو خدمات ان کے قلم اور دماغ نے کی ہیں اُن کو اب ابنائے زمانہ نے تسلیم کر لیا ہے۔ اُردو اخبارات کے دیکھنے والوں کے معلومات کو وسیع کرنے اور مفید اور دلچسپ خبریں اور مضامین بہم پہنچانے میں پیسہ اخبار لاہور خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اُن کے فہم رسا اور تجربے کا نتیجہ ہے +

قومیّت

ازصراط المستقیم قوم پا بیروں منہ
چوں گسست ازرشتہ سوزن زود خودرا گم کند۔

دُنیا کی قوموں میں خواہ کتنا ہی بُعد اور مابہ الامتیاز ہو اور خواہ کتنے ہی اختلافات اور تضاد پائے جائیں۔ یہ کہنا ہی پڑیگا کہ اُن سب کا شروع یا منبع ایک ہی ہے یا کسی وقت میں ایک ہی تھا گو بعض محققین نے قوموں کی تحقیقات کرتے یہ بحث بھی کی ہے کہ بعض قومیں بعض قوموں سے کوئی بھی قریبی نسبت نہیں رکھتی ہیں۔ مگر اخیر پر ایسے محققین کی آرا کا میلان بھی ادھر ہی ہُوا ہے کہ ان سب کا مخرج یا ابتدا ایک ہی ہونا چاہیئے۔[۱]

جو قومیں دوسری قوموں سے بعید فاصلے پر نظر آتی ہیں اُن میں بھی باوجود اس بعدِ اختلاف یا تباین عظیم کے چند ایسی نسبتیں پائی جاتی ہیں جو اِس بات کا استقرائی ثبوت ہیں کہ ان سب کا ابتدائی سلسلہ ایک ہی تھا۔

یہ ایک دلچسپ بحث ہے کہ اس قدر اختلاف قوموں میں کیوں ہو گیا اور اُن میں ایسا بُعدِ عظیم اور تباین کیوں پایا جاتا ہے۔ جب یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ شروع ان سب کا ایک ہی شعبہ اور مرکز سے ہوا ہے تو پھر ان مابہ الامتیازات کی اصل وجہ کیا ہے۔ گو ہم یہ بحث نہیں کرنا چاہتے کہ ان اختلافات اور اس تباین کی وجوہ کیا ہیں۔ لیکن یہ کہنے کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ موجودہ تباین کا بہت سا

---

[۱] انسان کا شروع چاہے حضرت آدم علیہ السلام سے مانا جاوے اور چاہے برہما سے۔ چاہے پہلی تحقیقات کے مطابق ڈارون کی تھیوری ہی مسلّم اور مقدم رکھی جاوے۔ ضرور ہے کہ اس سلسلے کا شروع ایک ہی ہو ۱۲

حصہ فروعات میں ہی۔ اصول[۱] میں کوئی اختلاف نہیں ہی اور یہ فروعی اختلاف بوجہ اختلافِ آب و ہوا اور مساکن یا طرزِ معاشرت کے ہوا ہی۔ اختلافِ آب و ہوا کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فروعی امور میں ایسے اختلافات ناشی ہوں۔ اختلافِ آب و ہوا سے صرف اجسام ہی متاثر نہیں ہوتے۔ اسکا بیماری اثر اخلاقی اور سوشیل اعتبارات سے طبائع اور دماغ پر بھی پڑتا ہی۔ جب ہم ایک گندی یا غلیظ ہوا سے ایک عمدہ اور صاف ہوا میں جاتے ہیں تو طبیعت کی اُمنگ اور جوش کسی اور ہی پیمانے پر ہوتا ہے۔ دماغ میں ایک قسم کی بشاشت اور طبیعت میں سرور پایا جاتا ہی۔ دِل میں ایک فرحت اور ایک تازگی پیدا ہوتی جاتی ہی۔ رنگت اور ظاہری حالت میں ہی نمایاں فرق نہیں ہوتا بلکہ خیالات اور قیاس میں بھی ایک جودت اور فراست محسوس ہونے لگتی ہے[۲]۔

گرم ملکوں کے رہنے والے کچھ اور ہی طبیعت رکھتے ہیں اُن کی دماغی طاقتوں اور ذہنی فراستوں کا مقیاس کچھ اور ہی ہوتا ہی۔ خلاف اس کے جو قومیں سرد ملکوں یا سرد آب و ہوا میں بود و باش رکھتی ہیں اُن کی طبیعت اور اُن کے دماغ کی کچھ اور ہی کیفیت ہوگی۔ جس طرح آب و ہوا اور زمین کے اختلاف سے نباتات[۳] میں باعتبار رنگت۔ ذائقہ۔ خاصیت کے ایک

---

[۱] اصولی خصوصیتوں سے وہ خصوصیتیں مراد ہیں جو سب قوموں اور سب قبائل کو شامل ہیں اور جن کے بغیر کوئی قوم موجود نہیں ہی اور نہ ہی موجود رہ سکتی ہی اگر کسی قوم کو اُن سے فرضاً بھی معرا تسلیم کر لیا جاوی تو گویا اُسے دائرہ انسانیت سے گرا دینا ہی ۱۲

[۲] بعض حکیموں کا یہ خیال ہی کہ آب و ہوا کی عمدگی ہی اچھے خیالات کی موجد یا باعث ہی۔ عمدہ آب و ہوا سے ہی دماغ تر و تازہ ہو کر اُن علمی مراتب تک پہنچتے ہیں جو انسانی ترقی کے اقصاء خیال کیے جا سکتے ہیں ۱۲

[۳] علمِ نباتات کے محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہی کہ ایک ہی جنس کی نباتات میں باعتبار آب و ہوا کے بیّن تبائن ہوتا ہے۔ حالانکہ اُن کا شروع ایک ہی وقت کے متعلق ہے صرف آب و ہوا کے اختلاف سے موجودہ فرق پڑ گیا ہی۔ چاء اور آلو اپنی اپنی جنس میں ایک ہی ہیں۔ لیکن امریکہ کے آلو۔ اور ہندوستان کے آلو میں فرق ہے ۱۲

نمایاں اور قابلِ لحاظ فرق ہوتا ہے اِسی طرح انسانی طبائع میں بھی مقابلتًا تباین موجود ہے۔

حتٰی کہ دماغ اور جن کی طبیعتیں زیادہ تر صحیح الحالت ہیں اُن کے خیالات اور قیاسات بہ نسبت اُن لوگوں کے زیادہ تر مجلّٰی اور صاف ہوتے ہیں جو کثیف الکیفیت ہیں۔

آب وہوا کے علاوہ ضروریات نے بھی قوتوں میں تفریق کی ہے۔ ضروریات کی وسعت اور اختلاف کا بہت سا حصہ بھی آب وہوا پر موقوف ہے۔ جو قومیں یا جو قبائل سرد آب وہوا میں رہتے ہیں اُن کی ضرورتیں ان قوموں سے مغائر ہیں جو گرم ملکوں میں بود و باش رکھتی ہیں۔ جو قومیں میدانی خطوں میں رہتی ہیں۔ ان کی ضرورتیں پہاڑی قوموں سے مختلف فیہ ہیں[1]۔

---

[1] بعض محققین نے یہاں تک وسعت دی ہے کہ انکے نزدیک زبانوں کا اختلاف بھی آب وہوا ہی کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح ان کے خیال میں لباسوں کا مختلف ہونا بھی آب وہوا اور ضروریات کے تباین کا ہی نتیجہ ہے۔ لباس کے اختراع میں بے شک ہر قوم کے مذاق کو بھی دخل ہے لیکن ضرورت نے بھی اس میں بہت کچھ حصہ لیا یا دخل دیا ہے۔ جس طرح قوموں میں ایک نسبت ابتدائی پائی جاتی ہے اسی طرح لباس میں بھی ایک ابتدائی نسبت موجود ہے۔ انسان کا پہلا لباس برہنگی ہے اس سے اتر کر ستر کا سوال پیدا ہوا۔ ستر کے خیال سے انسان نے پہلے پہل ہاتھوں سے کام لیا پھر پتوں سے۔ پھر رفتہ رفتہ لباس کی تراش خراش کی گئی۔ اگر دنیا کی سب قوموں کے لباس جمع کر کے دیکھے جاویں تو بادنیٰ غور یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ قوموں کے شروع کی طرح لباس کی بنیاد بھی ایک ہی سلسلے سے پڑی ہے۔ ہر قوم کا موجودہ لباس یہ پتہ یا یہ شہادت دیتا ہے کہ میں کسی اور قوم کے لباس سے نکلا ہوں۔ برہنگی اور معمولی ستر کے مقابلے میں شاید سب سے اول لنگوٹی کو شرفِ لباس ملا۔ رفتہ رفتہ لنگوٹی اصلاح پاتی پاتی چھوٹے اور بڑے تہ بند کی صورت میں آگئی۔ پھر چادر کا فیشن چلا اور چادر سے دھوتی بنگئی اور دھوتی سے پاجامہ کا وجود نکلا اور پاجامہ سے کسی کسی وقت پتلون بنگئی۔ اسی طرح ٹوپی اور پگڑی یا عمامہ کی ہستی ظہور میں آئی۔ اور اسی طرح واسکٹ یا صدری سے کرتوں اور قمیصوں کی نوبت آگئی اور دن بدن ان میں بھی طرح طرح کی اختراعیں اور ایجادیں ہوتی گئیں۔ انسان پہلے ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ ضرورت نے سمجھا دیا کہ پاؤں کے نیچے بھی کچھ رکھنا چاہئے غالبًا پہلے پہل چپلی کی صورت میں کوئی جوتا اختراع کیا گیا ہوگا اس سے ہوتے ہوتے مختلف اقسام کے جوتے اور بوٹ وغیرہ بننے گئے۔ لباس کا شروع شروع میں ایک شکل یا ایک ہیئت اور وضع سے ترقی پاتے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ ان سب قوموں کا شروع بھی ایک ہی تھا۔ اگر ایک شروع نہ مانا جاوے تو ساری دنیا کے لباس میں یگانگت اور اتحادی نسبت کا موجود ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ اتحادی نسبت صریحًا اس امر کا ثبوت ہے کہ ان سب کا شروع ایک تھا +

جیسے جیسے قومیں ضرورت کی وجہ سے نقل مکان کرکے اِدھر اُدھر پھرتی پھراتی رہیں ۔ ایسے ہی وقتاً فوقتاً اُن کے فروعی اجتہاد میں بھی تبدیلی آتی رہی ۔ یہانتک کہ ان تبدیلیوں سے ایک قوم بمقابلہ دوسری قوم کے چند خصوصیات کی وجہ سے تمیز کی گئی ۔ پہلے پہل شخصیت کی بنیاد رکھی گئی ۔ زاں بعد خاندان بنتے گئے اور خاندانوں سے قومیں بننی شروع ہوگئیں اور قوموں کی تفریق سے مستقل طور پر مقام وار تمیز قائم ہوگئی ۔

جب یہاں تک تفریق ہوگئی تو اُن کے تفاوت یا تحدید کے واسطے بمصداق وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اُن کے درمیان باعتبار عادات اور شعار کے ایک حدِ فاصل قائم ہوتی گئی ۔ یہ وہی حدِ فاصل ہے جو ایک قوم کو دوسری قوم سے خصوصیت اور تمیز دیتی ہے ۔ اور جس سے ہر فرد کے دل میں یہ خیال متمکن ہے کہ میں فلاں قوم میں سے ہوں اور فلاں فلاں قوم میں سے مجھے فلاں قوم میں شامل ہونے کا حق جدی حاصل ہے اور فلاں کو فلاں میں اُن قومی خصوصیتوں میں یہانتک استحکام ہوتا گیا کہ اُن کے خلاف چلنا اُس قوم میں سے نکلنے کے برابر ہوگیا انہیں لوگوں یا انہیں افراد کو اس قوم میں سے ہونے کا شرف بخشا گیا ۔ جن میں وُہ خصوصیتیں پائی جاتی رہیں جو اُن سے معرا تھے وُہ دُوسری قوم میں شمار ہونے لگے ۔ اور انہیں شعائر اور خصوصیتوں کو ان قوموں کا شعائر سمجھا گیا ۔

جس طرح ایک علم یا ایک فن دوسرے علم یا دوسرے فن کی بنیاد ہے اور ایک شاخ دُوسری شاخ کی ابجد ۔ اسی طرح ایک قوم دُوسری قوم کی شعبہ یا شاخ ہے جس طرح باوجود اس ترتب اور اس نسبت کے علوم اور فنون کے آثار اور مختصات جُداگانہ ہیں اور اسی حالت میں ایک علم یا ایک فن اپنی حد میں قائم اور محدود رہ سکتا ہے کہ اُس کے مختصات اور آثار سے اُسے تمیز دی جاوے اسی طرح کوئی قوم اُس وقت تک قوم کہلانے کا حق نہیں رکھتی جب تک اُس میں اُس شاخ کی خصوصیتیں اور قومیت نہ پائی جائے ۔ گو منطق اور فلسفے میں گو نسبت ہے لیکن جب تک منطق باعتبار اصول منطق تمیز نہ دیا جاوے منطق نہیں ہے جو اصولِ موضوعہ

منطق اور فلسفے کے مابین عملی تفریق کرتے ہیں۔ اُن کا وجود بہرحال ضروری اور لابدی ہے۔

اِس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ۔

الف۔ اس وقت تک کوئی قوم قوم کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتی ہے۔ جب تک اُس میں قومیت کی خصوصیتیں نہ پائی جاویں۔

(ب) جس قوم میں قومی خصوصیتیں نہ پائی جاویں وُہ قوم نہیں ہے۔ بلکہ ایک مجموعہ افراد ہے جس طرح دُنیا میں اور افراد پائے جاتے ہیں۔

(ج) ایک قوم سے چند افرادِ انسانی کا مجمُوعہ مراد ہے۔ جب اُس مجموعے میں قومیت کی خصوصیتیں پائی جاویں جس سے اُنکو تمیز دیا جا سکے تو کہا جاویگا کہ اُن افراد میں قومیت[۱] موجود ہے۔

قوم ایک ڈھانچ یا ایک جسم ہے اور قومیت ایک رُوح یا جان کوئی ڈھانچ یا کوئی جسم رُوح اور جان کے بغیر زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح کوئی قوم بغیر جوشِ قومیت کے زندہ قوم نہیں کہی جا سکتی۔

جو خصوصیتیں ایک قوم سے دُوسری قوم کو تمیز دیتی ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں۔

(۱) یا تو وُہ ایسی خصوصیتیں ہیں جن سے ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں بلحاظ عوارض تمیز دی جاتی ہے۔

(۲) یا ایسی خصوصیتیں ہیں جن سے ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں باعتبار ملزومات تمیز دی گئی ہے۔

عارضی خصوصیتوں کے اندر ضرورتاً تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور ایسی عارضی تبدیلی سے اصلیت یا حقیقت الامر میں کوئی فرق یا کوئی انقلاب نہیں آتا ہے لیکن ملزومات کی تبدیلی سے اس خاصے میں

[۱] ہر انسان عرفاً انسان ہے لیکن ہر انسان شجیع اور فصیح نہیں ہو سکتا۔ شجاعت اور فصاحت دو جداگانہ خاصے ہیں یہ خاصے کچھ تو طبعی ہوتے ہیں اور کچھ انہیں ترقی بھی دی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر شخص ایک قوم میں داخل ہے لیکن جب تک اس میں جوشِ قومیت نہ ہوگا تب تک اس کی نسبت یہ نہیں کہا جاویگا کہ اس میں مادّہ قومیت یا جوشِ قومیت بھی موجود ہے اور اُسے اُس سے بھی کوئی نسبت نہیں ہے ۱۲

ضعف یا تبدیلی کرنے کا اندیشہ ہو۔ جسے دُوسرے الفاظ میں۔ قومیّت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہو کہ فلاں قوم پر ادبار پڑ گیا یا فلاں قوم بگڑ گئی۔ تو اُس کا ہمیشہ یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ وُہ قوم دنیا کے طبقے سے ہی اُٹھ گئی ہو۔ یا اُس کا کوئی فرد بھی باقی نہیں رہا ہے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے اُس قوم کے اندر مادہ قومیّت کا نہیں رہا ہے۔ یعنی وُہ جوشِ قومیّت نہیں رہا ہے جس سے قومیّت کی بنیاد پڑتی ہو اور جس سے ایک قوم بمقابلہ دُوسری قوم کے تمیز دی جاتی ہو۔ قومیں کب بگڑتی ہیں اور اُن کے عروج میں کب فرق آتا ہو جب اُن میں مادہ یا جوشِ قومیّت نہیں رہتا ہو یا اُس میں ضُعف آجاتا ہے۔

یہ کہنا کہ جو قوم بگڑتی ہو وُہ پھر کبھی نہیں بنتی۔ تاریخ کے خلاف جانا ہو اور نیز قدرتی قوانین سے انحراف کرنا تاریخیں شاہد ہیں اور قانون قدرت گواہ۔ قومیں بنتی بھی ہیں۔ اور بگڑتی بھی ہیں اور بگڑنے کے بعد بن بھی جاتی ہیں۔

تنزل اقوام کے بواعث مختلف ہوتے ہیں۔ محققوں نے قوموں کے اسبابِ تنزل پر دلچسپ بحثیں کی ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہو کہ جو قوم قومیّت چھوڑ دیتی ہو یا اس سے دُو چار ٹتی ہے وُہ مُردہ ہو جاتی ہو اُس میں سے وُہ جوش نکل جاتا ہو جسے دُوسرے الفاظ میں قومی غیرت کہا جاتا ہے۔ غیرت سے وُہ طریقہ یا وُہ طریقِ عمل مراد ہو جس سے ایک خصوصیّت[ل۱] کے قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہو جو ایک طاقت یا ایک شاخ کو دُوسری طاقت یا شاخ سے تمیز دیتی ہو۔ جو قوم

ل۱ بعض قوموں نے بجائے جوشِ قومیّت کے قوم کو ذات کے مفہوم میں منتقل کرکے قومی تفریق سے اور بھی نقصان اُٹھایا ہو قومی تمیز باعتبار قومیّت کے مقابلتاً لازمی ہو لیکن قومی تمیز ذات کے معنوں میں سخت نقصان رساں ہو۔ بیشک ایک فرد قوم یا ایک خاندان اور ایک قبیلہ قوم باعتبار شرفِ ذاتی یا علو عمل کے ممتاز سمجھا جا سکتا ہو۔ لیکن اُسے ایک اصُول نہیں قرار دیا جا سکتا من حیث الافراد یہ لکھنا کہ شرف و فضیلت اپنی ذات بعض حالات میں درست ہو۔ بہ معنی عام درست نہیں ہو۔ من حیث المجموعہ قومیّت کا ترک کر دینا اور جوشِ قومیّت سے انحراف کرنا اپنے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے اعزاز قومی کو برباد دینا ہو۔ افتخار ذاتی اور شے ہو اور افتخار قومیّت شے دیگر ۱۲

متنزل ہو اُس پر لازم ہو کہ دُوسری ترقّی یافتہ قوم کے نقشِ قدم پر چلکر ضروریاتِ زمانہ کے مطابق ترقی کرے اور وُہ وسائل اور ذرائع فراخ دلی سے اختیار کئے جاویں جو موجباتِ ترقّی ہیں۔ لیکن اُس کے ساتھ قومیّت یا جوشِ قومیّت اور خصائلِ قومیّت سے دست بردار ہوتے جانا ایک ایسے گڑھے میں اپنے تئیں گرانا ہو جو اپنے عمق میں پہلے ہی صدہا قوموں کو ڈبو چکا ہے۔

جب کبھی زمانہ اصلاح کا جوش پھیلاتا ہو تو ہر کہ ومہ کی طبیعت میں ریفارمیشن کی اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں اور ہر شخص اپنی بساط کے موافق اس میں حصہ لیتا ہو تعلیم یافتوں اور سمجھ داروں میں ہی یہ امنگ یا یہ جوش نہیں ہوتا۔ جاہلوں اور ناتعلیم یافتوں میں بھی اس کا اثر پایا جاتا ہو۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ نئے لوگ نئی تجویزات کے مطابق کام کرتے ہیں اور پُرانے دیرینہ اصُولوں پر جو لوگ دیرینہ اصُولوں کے معاون یا دلدادہ ہیں دراصل وُہ بھی اپنی رائے کے مطابق ایک اصلاح کرتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں وُہی غلطی اور وُہی لغزش زیادہ تر گرفت کے قابل ہو جسے قومیّت کی غلطی یا اس کا برُا استعمال کہا جاتا ہے۔

طبیعتیں کبھی کبھی اصلاح کے جوش میں اُن راہوں سے نکل جاتی ہیں۔ جن میں قومیّت یا جوشِ قومیّت کے آثار قریبًا معدوم دکھائی دیتے ہیں۔ گو ایسی طبیعتیں اور ایسے لوگ بعض ترقیات کے مالک ہو جاتے ہوں۔ لیکن چونکہ ان میں قومی جوش یا قومی خصوصیت مفقود ہوتی ہے اور محض ایک نمائشی سماں ہوتا ہو۔ اس لئے اُن کا وُہ جزوی عروج یا ترقی بجائے سود مند ہونے کے مضر پڑتا ہو۔ کوئی قوم دُوسری ترقی یافتہ قوم میں مِل جانے سے یا اُن کے آثار اور خصوصیتوں کے قبول کرنے سے قوم نہیں بن سکتی۔ یا اپنی قومیّت عزّت کے ساتھ قایم نہیں رکھ سکتی۔ جب تک کہ اس میں اپنی قومیّت کی خصوصیتیں اور آثار نہ پائے جائیں[۱]

یورپ کی قومیں اس زمانہ میں بیشک عروشِ ترقی پر ہیں لیکن انتہائی قومیں اُن کی

[۱] ہم ان خصوصیتوں اور آثار کا کسی دوسرے موقع پر ذکر کرینگے۔ جنہیں کسی ایک قوم کے مقابلے میں قومی آثار یا قومی خصوصیتیں کہا جا سکتا ہے ۱۲

قومیت اور خصوصیاتِ قومیت میں محو اور ممتزج ہو کر ایک قوم نہیں کہلا سکتی ہیں۔ ترقی یافتہ قوموں کے خیالات اور فضائل کا مکتسب ہونا اچھی عادت اور اچھا طریقہ ہے۔ لیکن اپنی قومیت یا جوشِ قومیت سے معرّا اور خالی ہو جانا اپنی قوم کا خون[1] کر دینا ہے۔ پہلی قومیت صرف دو جہت سے ٹوٹ جاتی ہے۔

(الف) بذریعۂ انتقالِ خون۔

(ب) بذریعۂ تبدیلِ مذہب۔

دوسری قوم میں جا کر یا شامل ہو کر شادی نکاح رشتہ داری پیدا کر کے اُن میں ہمیشہ کے واسطے مل جانا کسی نہ کسی وقت پہلی قومیت کو توڑ دیتا ہے۔ مگر یہ حالت بھی افراد سے مخصوص ہے نہ کہ مجموعہ افراد سے اور اس حالت میں بھی مدتوں تک پہلا داغ نہیں مٹتا جب کبھی تحقیق ہوتی ہے پہلی قومیت جھلک دے ہی جاتی ہے۔

تبدیلِ مذہب سے بھی پہلی قومیت ٹوٹ جاتی ہے۔ مذہب بھی ایک ایسی طاقت ہے جو خاصۃً قومیت پر بالخصوص غالب آتی ہے اور اُس کے کل اجزا میں حلول کر کے اُسے اپنے رنگ پر لے آتی ہے۔ قومیں قوموں سے صدیوں لڑتی بھڑتی رہیں لیکن جب ایک قوم یا دوسری قوم کا مذہب قبول کر لیا تو اُن میں سے ایک قوم کی قومیت زائل[2] ہو گی۔ یا نسبتًا ایک نئی قوم بن گئی۔

[1] جو لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دُوسری قومیت میں مل کر اپنی قوم یا اپنی شاخ کو ترقی دیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر ترقی یافتہ قوم تنزل افراد کے لئے اپنی قومیت سے دور نہیں رہ سکتی۔ اُس میں طاقت تو ہے کہ ایسے چند افراد کو اپنے آپ شامل کرے لیکن یہ ہونا مشکل ہے کہ ان افراد کی خاطر وہ دوسری قوم کی قومیت ہو جاوے ۱۲

[2] باوجود اس کے کہ مذہبی طاقت بسا اوقات قومیت یا جوشِ قومیت پر غالب آتی ہے۔ پھر بھی تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ قومیت کا رنگ بعض اوقات دور ہونے میں نہیں آیا۔ ساری یورپین قومیں ایک ہی مذہب رکھتی ہیں مگر پھر بھی ان میں قومیت کے جوہر جداگانہ چمک دمک مارتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے اعتبار سے اور جیسی دین کی جہت سے جدید عہد نامے کے مصدق اور نام لیوا ہیں اور دیگر یورپین عیسائیوں کے ہم نوا لیکن دیکھو تو ان میں بھی تفریق قومیت کا جلوہ یا سماں کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہی ہے پھر کس طرح لکھا جا سکتا ہے کہ دوسری غیر مذہب قومیں ان اقوام کی قومیت کی وارث بن جاوینگی۔ یہ نظیریں اس امر کا بدیہی ثبوت ہیں کہ قومیت بہت مشکل سے دور ہوتی ہے ہاں جب فضائل قومی کو ترک کیا جاوے تو فرق ضرور آ جاتا ہے ۱۲

جن قوموں نے تنزل میں ہو کر ترقی پائی اور عروج حاصل کیا ہے اور جنہیں ریفارمیشن کی ضرورت پیش آئی ہے اُن کا ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ باوجود سب قسم کی فتوحات اور اکتساب کے اپنی قومی خصوصیتوں اور قومیت کو نہ چھوڑا جاوے۔ یہی اصول اور یہی معاہدہ تھا جو ان قوموں کی مستقل حرمت اور عزت کا باعث ہوا ہے۔ ہر طاقت یا ہر وجود میں ایک ایسی خواہش موجود ہے جسے آن کہا جاتا ہے اُس آن سے ہی اُس طاقت یا وجود کی وقعت اور حرمت ہوتی ہے۔ قومی خصوصیتوں اور قومیت کو قائم رکھنا دراصل اس آن کو قائم کرنا ہے جو ریفارمر یا جو مصلح یا مجدد احتیاجاتِ قومیت سے گریز کرتا اور اس سے متعرض ہو وہ اپنے تئیں کیا دیگر افراد کو بھی ایک تہلکہ میں ڈالتا ہے۔

اگر یہ خواہش اور یہ آرزو ہو کہ ایک قوم کو دوسری قوم کے مقابلے میں عزت دی جاوے تو قومیت سے انحراف یا اعراض ایک گناہ کبیرہ[۵۱] سمجھا جاوے۔

اس بات کا فیصلہ کہ کسی قوم کی قومی خصوصیتیں کیا ہیں اور قومیت کیا یا کیا ہونی چاہئیں مخفی اور مستتر نہیں۔ جن خصائل اور جن خصوصیتوں اور شعائر کی وجہ سے ترقی کے گذشتہ زمانوں میں کوئی قوم شناخت کی جاتی اور عزت دیجاتی رہی ہے۔ وہی شعائر اب بھی اس کی خصوصیات میں داخل ہیں اور قومیت کے اجزائے لازمیہ۔ یہی ایک اصول ہے جو جوشِ قومیت کے قائم رکھنے کے لئے سدِ سکندری کا کام دیتا ہے۔ کوئی قوم اُس وقت تک حقیقی صلاح اور فلاح کی مالک نہیں ہو سکتی جب تک اس میں جوشِ قومیت نہ ہو جوشِ قومیت اُس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک قومی خصوصیتیں زندہ اور موجودہ نہ ہوں۔ خصوصیات قومی کیا ہیں۔ ایک قومی جھنڈا یا قومی نشان۔ جس کا کوئی نشان

---

[۵۱] دنیا میں ہر شے کی طاقت اور حرمت ایک نسبت رکھتی ہے۔ نسبت کا توڑنا اور اس سے اعراض خود اپنے تئیں ذلیل کرنا اور توڑنا ہے۔ جب تک ایسی نسبت قائم نہ رہے نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی قوم بحیثیت قومیت کے ایک قوم ہے۔ جن قوموں میں قومیت ایک فرض عین سمجھی جاتی ہے اور جو اپنی قومیت کے دلدادہ یا فدائی ہیں ان کی نگاہوں میں بھی ایسے قوم فروش یا قومیت شکن لوگ عزت اور وقعت کی نگاہوں سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ گو کہ وہ زبانِ حال سے اس کی نسبت ایسے لوگوں سے کچھ قیل و قال نہ کریں ۱۲

اور کوئی تمیزی خصوصیت نہیں ہی وُہ قوم مردہ ہی۔ ہر مقام ہر زمانے میں اپنے ہی نشان سے شناخت کی اور عزت دیجاتی ہی اور شناخت کی جانی چاہئے۔ چاہے کوئی کتنی ہی ترقی کرلے اور کیسے ہی عروج پر پہنچ جاوے جب تک وُہ اپنے نشان کے نیچے نہیں آئیگا اُسے اُس قوم میں سے نہیں کہا جائیگا صرف تعلیم یافتہ۔ مہذب امیر بادشاہ خود مختار ہوجانا خوشی کا موجب نہیں۔ خوشی کا موجب اور عزت کا باعث کیا ہے۔

قومیّت کا حامی ہونا قومیّت کو قائم رکھنا قومیّت کو نباہنا۔

جس قوم یا جس قوم کے افراد میں یہ خصوصیات نہیں ہیں وُہ ایک قوم کے برائے نام افراد ہیں۔ اُن میں قومیّت اور قومیّت کا جوش نہیں ہے۔ لوگ شخصیّت کے قائم اور باقی رکھنے یا نباہنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن جب قومیّت کے مرحلے پر پہنچتے ہیں تو انہیں یہ قاعدہ یاد نہیں رہتا جس طرح شخصیت بغیر خصوصیات شخصیّت کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح قومیّت کا ہی بغیر خصوصیات قومیّت کے باقی یا قائم رہنا مشکل ہے۔ ؎

منہ زِ نہار اے غافل زحدِّ خود قدم بیروں
کہ ریزد خونِ خود صیدے کہ آید از حرم بیروں

میرزا سُلطان احمد

خوش ہی وہ شخص جس نے دانائی حاصل کی ہو۔ دانائی کی تجارت چاندی سے بہتر ہی اور اس کا منافع خالص سونے سے اچھا۔ اسکی قیمت لعلوں کے ڈھیر سے بڑھکر ہی۔ لعل کیا کوئی چیز بھی اس کے مقابل نہیں ہوسکتی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں درازی عمر ہی اور بائیں میں دولت اور عزت۔ اس کے انداز خوش آیند انداز ہیں اور اسکی راہوں میں امن ہی امن ہی۔

(ترجمہ) (میر نذیر حسین)

"نقاب" اور "گھونگٹ"

ملبوسات پر کچھ لکھنا شیخ محمد اکرام صاحب کا حصہ ہے جو اس کے قبل کلاہ و دستار اور دوپٹے پر پُر لطف مضامین لکھ چکے ہیں - اور باقی جن کپڑوں کی نسبت اُن کا وعدہ ہے اُن میں انصافاً نقاب اور گھونگٹ کو بھی شامل کرنا چاہئیے مگر میں چاہتا ہوں کہ شیخ صاحب سے پہلے ان دونوں پر بطریق اجمال اپنے خیالات ظاہر کروں - اُمید ہے کہ مجھ کو پیش قدمی کی اجازت دیدی جائیگی -

نقاب اور گھونگٹ دونوں ایشیا کی پیدائش ہیں - یورپ کے فیشن میں جہاں کہیں نقاب کو استعمال کیا جاتا ہے وہ اس کے اصلی مقصد سے کوسوں دُور ہے - وہاں باریک ریشم کی نقابیں ڈالی جاتی ہیں - جن سے چہرہ چھپانے کی غرض نہیں اظہار حُسن اور زیبائش کی افزونی مدِنظر ہوتی ہے - یہ نقابیں عُمدہ سیاہ ہوتی ہیں - جنمیں سرخ سفید چہرے کا جھلکنا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے گویا چاند پر ہلکے سے ابر کا ایک ٹکڑا ہے - جس میں سے چاندنی چھن رہی ہے - نقاب میموں کی چھجہ دار ٹوپی میں اٹکی ہُوئی ہوتی ہے اور نیچے کا حصہ ٹھوڑی میں پھنسا دیا جاتا ہے - اِس لئے نقاب کا کپڑا آنکھوں سے کئی انگشت دُور رہتا ہے - اور پلکیں ہلنے جُلنے میں آزاد رہتی ہیں - تاہم یورپین ڈاکٹروں کی شکایت ہے کہ اس نقاب کے فیشن سے آنکھوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے -

ایشیائی نقاب کی نسبت خبر نہیں کہ اس کا رواج کب اور کہاں سے شروع ہوا اس کی مختلف صورتیں اور مختلف نام ہیں - مگر مقصود صرف ایک ہے کہ رُخ غیر نظروں سے بچایا جائے - ترکوں - عربوں - ایرانیوں میں نقاب کے الگ الگ طریقے ہیں - کہیں ایک لمبی چادر سر سے پیر تک لپیٹ لی جاتی ہے - اس طرح کہ ماتھا - ٹھوڑی - ناک تو ڈھک جائے اور آنکھیں کھلی رہیں - کہیں بُرقع ہوتا ہے - جس میں ماتھے کے قریب ایک چھوٹا سا کپڑا ٹانک دیتے ہیں جو چہرہ کو بخوبی ڈھک سکے - اس کپڑے میں چند سُوراخ ہوتے ہیں - جنکے سبب آنکھیں اپنا کام کرسکتی ہیں -

مگر کسی ملک میں نقاب کے افسانے فارس کی طرح عوام کے زبان زد نہ ہونگے۔ وہاں کے شعرا نے اس ذرا سے ٹکڑے پر بڑی بڑی طبع آزمایاں کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایران کے امرد لڑکے بھی نقاب ڈالتے تھے۔

عرب کی شریف زادیاں منہ پر نقاب ڈال کر بازاروں میں چلتی پھرتی اور خرید فروخت کر لیتی ہیں اسی کے قریب ایران اور ترکستان کی نسبت مشہور ہے۔

نقاب پوشی ایشیائی شرم وحیا۔ عفت وعصمت کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہے۔ جس کے باعث عورتیں آزاد رہکر بدنگاہوں سے محفوظ رہتی ہیں۔

ہندوستان جس کی نسبت مشہور ہے کہ مسلمانوں کی صحبت سے یہاں پردہ کا رواج ہوا ہزاروں برس سے گھونگٹ نکالنے کا عادی ہے۔ ممکن ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں اس کی عادت نہ ہو مگر اکثر مقامات پر اس کے وجود کا پتہ لگتا ہے۔

لکھا ہے کہ مہاتما بدھ کے ظہور سے پہلے ہند میں گھونگٹ کی رسم موجود تھی۔ چنانچہ جب انکی رانی گوپا نے اس رسم کو ترک کر دیا تو تمام ملک میں ایک عام چرچہ اور غل پڑ گیا تھا۔ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے کلام میں گھونگٹ کا بڑے لطیف اور پُر درد لفظوں میں ذکر پایا جاتا ہے۔ یہاں آجتک گھونگٹ کا طریقہ جوں کا توں موجود ہے۔

ہندوؤں میں ادنیٰ اور متوسط درجے کی عورتیں باہر چل پھر سکتی ہیں جن میں گھونگٹ عرب و ایران کی نقاب کا کام دیتا ہے۔ مگر گھونگٹ میں کئی خرابیاں ہیں جو نقاب میں نہیں۔ گھونگٹ اوڑھنی یا چادر کے اس سرے کا نام ہے جو سر پر سے کھسکا کر چہرہ پر جھکا لیا جاتا ہے۔ جو کبھی آدھے چہرے اور کبھی تمام چہرے کو ڈھک لیتا ہے۔ چونکہ اس میں آنکھوں کے لئے کوئی روزن نہیں ہوتا بیچاری عورتیں ایک ہاتھ سے گھونگٹ اٹھا کر راستہ چلتی ہیں۔ اور انہیں بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔

دستور ہے کہ بیاہی ہوئی لڑکیاں اپنے میکے کے آدمیوں یہانتک کہ میکے کی آبادی کے تمام مردوں سے منہ نہیں چھپاتیں۔ مگر سسرال میں جاکر ان کو سب کے سامنے گھونگٹ

نکالنا پڑتا ہے۔ اور بیچاریاں اس پر تمام عمر کاربند رہتی ہیں۔ نقاب اور گھونگٹ کے ان ظاہری معنوں کے بعد ذرا باطنی معانی پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔ یہ تمام موجوداتِ عالم جس کو جسم کی آنکھیں محسوس کرتی ہیں ایک پردہ نشین کی نقاب اور ایک حیادار کا گھونگٹ ہی۔

خود ہمارا جسم نقاب ہی۔ ہماری ظاہری زندگی گھونگٹ ہی۔ جو نظرباز ہیں پردہ نقاب اور حجابِ گھونگٹ اُٹھنے کے متمنّی رہتے ہیں۔ اور اُن کی یہ آرزو عوام میں عرفان کہلاتی ہی۔

مہاتما بدھ کا جنہوں نے اسرارِ باطن کے بہت سے پردے اُٹھائے تھے اُن کی کُرائی پر ذرا سا پرتو پڑا تھا جو انہوں نے اس ظاہری گھونگٹ کو اُٹھا ڈالا۔ اگر کوئی کامل نظر پڑ جاتی تو گویا کا بھی بیڑا پار تھا ٭

حسن نظامی (دہلوی)

دُنیا

چمنِ جنارِ خار ہے دُنیا — خونِ صد نو بہار ہے دُنیا
زندگی نام رکھ دیا کس نے — موت کا انتظار ہے دُنیا
ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور — دیکھنے کو بہار ہے دُنیا
ہے تمنّا فزا ہوائے جہاں — کیا شکستِ خمار ہے دُنیا
خون روتا ہے شوقِ منزل کا — رہزنِ رہ گزار ہے دُنیا
جان لیتی ہے جستجو اس کی — دولتِ زیرِ مار ہے دُنیا
پاسِ دِہ امید کا ملاوا ہے — کوئی جاتی بہار ہے دُنیا
خندہ زن ہی فلک زوال پہ جہاں — چرخ کی رازدار ہے دُنیا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اس چمن کو نہیں بہار پسند

(یکے از نیازمندین) (ر۔ ق۔ اقبال)

مَوت

حوادثِ زندگی میں مَوت بھی نہایت دلچسپ واقعہ ہے۔ عام حادثۂ زندگی ہونے کی جہت سے اُس کے حقائق پر بہت کم غور و تامّل کیا جاتا ہے۔ روز دس پانچ آدمیوں کو مرتے دیکھنے اور سُننے سے ہمارے کان اور آنکھ اس کے ایسی عادی ہو گئے ہیں کہ دم بھر کے لئے بھی ہم اپنے ذہن کو اُس کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے رجوع نہیں کر سکتے۔ جب ہم کو بھی اوروں کی طرح ایک دن مرنا ہے تو خیالِ موت قبل از موت واویلا ہے۔ حقیقت میں اس کا نام تک لینا بسا اوقات ناگوار ہوتا ہے۔

مَوت کی علامات اور تکالیفِ نزع اور دم نکلنے کا وقت مرنے والے کے بُشرہ کے مکروہ آثار اور جسم کی غیر ارادی حرکات دیکھ کر بیساختہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے میں بہت سختی اور ایذا ہوتی ہے جس کے مقابلے میں دُنیا کی اور تکلیفیں ادنیٰ اور حقیر ہیں۔ جس قدر خوف ہم کو مَوت سے ہے وُہ زیادہ تر بلحاظِ مشاہدہ احوال کے ہے جو مرنے کے وقت یا قریبِ زمانہ موت کے ہم مریض کا دیکھتے ہیں۔ محبوب صورتوں اور چیزوں کی جدائی ایک لمحہ کے لئے شاق ہوتی ہے۔ پھر بھلا اس رنج کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جو مرنے والے کو مرنے کے وقت ہوتا ہے۔ جب وہ نگاہِ حسرت سے اپنی عمر بھر کی کمائی کی طرف اور آشنا چہروں کی جانب دیکھے اور یہ خیال کرے کہ کوئی دم میں ہمیشہ کے لئے اُن سے بچھڑ جاؤنگا۔ خواہ یہ تکلیفِ نزع ہمارے اعمالِ سابقہ کے نتیجے ہوں یا رنجِ مفارقتِ احبا ان کا باعث ہو۔ لیکن موت ایک عظیم واقعہ ہے اور اس کی عظمت نہ اس وجہ سے ہے کہ اس کے عارض ہونے سے ہمارا شمار مُردوں میں ہونے لگتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ یہ بعض لوگوں کا مُدعا اور مقصودِ خاص ہے۔ ہزاروں مفلس روز طلبگارِ موت رہتے ہیں اور افلاس اور تنگدستی کے سامنے موت کو ہیچ جانتے ہیں۔ سینکڑوں مریض صعوباتِ مرض سے تنگ آکر آمادۂ مَوت ہو جاتے ہیں

اور بہت سے ذی آبرو و اہلِ حمیت ننگ و عار سے بچنے کے لئے اسکو اختیار کر لیتے ہیں۔ بہت سے مجاہد اشاعتِ دین کے لئے لڑکر مر گئے۔ بہت سے عاشقوں نے اپنے معشوقوں کے کہنے پر اپنی جانیں دیدے ڈالیں۔ ہزاروں جنرل شہرت حاصل کرنے کے لئے مر گئے۔ ان سب کا مقصود طلبِ موت یا سعی الی الموت سے یہ تھا کہ جس حالت میں وہ تھے اُس سے مرجانے کو بہت زیادہ آسان جانتے تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک موت میں زیادہ لذت تھی بمقابلہ اس حالت کے جس کا ذائقہ اُن کے مذاق کے مخالف تھا اور جس چیز کو مر کر حاصل کیا وہ اُن کو جانوں سے زیادہ عزیز تھی۔ پس موت میں ایک ایسا اسرار ہے جو کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ کبھی لوگ اس سے خائف بھی پائے جاتے ہیں۔ اور کبھی اس کی آرزو میں دست بدعا۔ یہ ایک عجیب امر ہے خوف و رجا اس سے دونوں وابستہ ہیں۔

اگر موت میں تکلیف ہے تو نامرد و بہادر دونوں کے لئے یکساں ہے اور اگر کوئی تکلیف نہیں ہوتی تو خوف بیفائدہ ہے۔ علاماتِ موت بعنوان و اشکالِ مختلف ظاہر ہوتی ہیں۔ ہرچند کبھی دو مرنے والوں کی حالت علامات کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتی۔ مگر بعض علاماتِ عامہ ایسی ہیں جو اکثر موت کے وقت ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً ناک کا خمیدہ ہو جانا۔ پاؤں کا سرد ہونا اور سردی کا اوپر کی طرف چڑھنا۔ مریض کا کپڑوں کو نوچنا۔ آواز میں گرانی آجاتی ہے۔ کلام بہ تکلف کیا جاتا ہے۔ سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔ بصارت کم ہو جاتی ہے۔ آخرالامر دل کا فعل ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے اور اسی سے مراد ہلاکت ہے۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ موت لامحالہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں کہ ہم یہ خیال کریں کہ مرنے میں پیدا ہونے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ یہ خیال زیادہ تر اس وجہ سے ناشی ہوتا ہے کہ مرتے وقت چند حرکات غیر اختیاری اور نیز چہرہ کا بگاڑ واقع ہوتا ہے لیکن یہ بات نہایت صحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان حرکات اور تشنج اور بشرہ کے مکروہ آثار سے ہم کو مطلق تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اکثر تو اس طرح واقع ہوتے ہیں کہ ہم کو اُن کا علم بھی نہیں ہوتا۔

ہمیں قیصر جولیس کا قول یاد رکھنا چاہئے کہ نامرد ہر روز مرا کرتا ہے لیکن بہادر صرف ایک مرتبہ موت کا مزہ چکھتا ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے وہ ضرور ایک دن موت کا شکار ہوگا۔ ؎

ہر آں کہ زاد بناچار بایدش نوشید ز جامِ دہر مے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

سوائے ذاتِ خداوندی کے اور کسی کو بقا نہیں ؎ نہ گل رہیگا نہ گل میں رہیگی بو باقی۔ فدا یہ ہو کہ گو تجھ پر رہیگا تو باقی

اطالین نمائش

جن ذرائع سے مغربی دُنیا میں علوم وفنون کی ترقی کی کل کو چلایا گیا ہے۔ اُن میں ایک مقبول اور دلپسند ذریعہ نمائشیں ہیں۔ نمائشیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ سب سے اعلیٰ تو وُہ ہیں جو مختلف مُلکوں کی متفقہ کوشش کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور تمام شائستہ دنیا پر کم وبیش اثر ڈالتی ہیں۔ زمانہ حال میں اس قسم کی نمائشوں میں چکاگو کی مشہور نمائش۔ پیرس کی عالمگیر اگزبشن اور سب سے نئی سنٹ لوئس کی نمائش قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نمائشیں تو تاریخی یادگاریں ہیں اور جب اقوامِ مغرب کی ترقی کی تاریخ لکھی جائیگی تو اُس میں ان نمائشوں کے سال سنگِ نشان کا کام دینگے۔ اِن کے لئے روپیہ اس قدر درکار ہے۔ کہ اکثر مغربی قومیں باوجود اپنے تمول کے اِن کے مصارف سے عاجز آتی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سنٹ لوئس میں خاطر خواہ مالی کامیابی نہیں ہوئی۔ اِس لئے ان نمائشوں کا مفصل تذکرہ ہم غریبوں کے لئے جو ایک نادار مُلک میں پیدا ہوئے ہیں۔ مفید نہیں۔ ہم ابھی اُس مقام سے جس کا تقاضا ایسی نمائشوں کا اہتمام ہوتا ہے منزلوں دُور ہیں۔ اِن کے سوا یورپ اور امریکہ میں کئی نمائشیں بعض فنون کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ مثلاً زراعت کی نمائش جُدا۔ جس میں مختلف قسم کے بیج۔ کھاد۔ آلات کشاورزی اور دیگر اسبابِ زراعت دکھائے جاتے ہیں۔ دُودھ اور مکھن کی نمائش الگ۔ جس میں مختلف کارخانوں کو باہمی مقابلہ کا علیحدہ موقعہ دیا جاتا ہے۔ پنساری اور عطّار اپنی نمائش علیحدہ رکھتے ہیں۔ فوجی نمائش جداگانہ ہے۔ تصویروں کی نمائش ایک مستقل چیز ہے۔ جس میں صاحبانِ فن اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ غرض ہر پیشے اور ہر ہُنر کے لوگ اپنی اپنی ترقی کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان دونوں قسموں کے علاوہ ایک اور قسم نمائش کی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر طبقے کے لوگوں کو چھوٹے سے پیمانے پر واقفیتِ عامہ بڑھانے کا موقعہ مل جائے اور ساتھ ہی تفریح کا مقصد بھی حاصل ہو۔ یہ نمائشیں ہمارے ہاں کے میلوں کا جواب ہیں۔ اور انہیں مہذب میلوں کا لقب

دیا جاسکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ میلا ایک دو دن کی دل لگی۔ چند گھنٹوں کی گھبراہٹ۔ جانے کی دھوم دھام۔ واپس آنے کی مار امار۔ دھکّے کھانے کے لُطف اور بےپرہیزی کرنے کی اجازت کا نام ہوتا ہے اور اس کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے۔ جو بچپن اور آغازِ شباب تک تو اس سے حاصل ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد دِن بدِن زائل ہونے لگتی ہے اور آخر جاتی رہتی ہے۔ مگر یہ مہذّب میلے ہفتوں بلکہ مہینوں رہتے ہیں۔ لوگ اطمینان سے اُن میں جاتے ہیں بیفکری سے اُن میں چلتے پھرتے ہیں۔ ہر طرح کے تماشے اور دلچسپی کے سامان ایک احاطے کے اندر جمع ہیں۔ جن سے ہر شخص حسبِ مذاق و توفیق فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور اُن میں جانا اور انہیں دیکھنا سَیر کی سَیر اور تعلیم کی تعلیم ہوتی ہے۔ لندن کے اس قسم کے میلوں میں سے ایک میلا چند ہفتے ہُوئے ختم ہوا ہے۔ جب مَیں مئی کے مہینے یہاں آیا تو شروع تھا اور اکتوبر کے اخیر تک رہا۔ اِس میلے کی ترکیب یہ ہے کہ ایک وسیع احاطہ اِس کے منتظموں نے گھیر رکھا ہے۔ جس کا نام ارلز کورٹ ہے۔ اِس میں ہر سال نئی نمائش ہوتی ہے۔ جو کئی مہینے تک رہتی ہے۔ چند سال ہُوئے یہاں پیرس کی زندگی کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اِس کے بعد ایک برس۔ یہاں "نمائشِ آتش" تھی۔ جس میں مکانات کا جلنا۔ آگ بجھانے والی فوج کا مستعدی سے اُن کے بچانے کو دوڑنا۔ اور جانفشانی سے لوگوں کے جان و مال کو بچا لینا دکھایا گیا تھا۔ اِس مرتبہ ملک اطالیہ کی باری تھی۔ اور نمائش میں جانا یہ معنے رکھتا تھا کہ آپ اچانک آنکھ بند کر کے اطالیہ کے مشہور مقامات میں سے کسی کی سیر کر رہے ہیں۔ داخل ہوتے ہی دربان اطالیہ کے لباس میں ملبوس نظر آتے تھے۔ دوکانیں ہیں کی سنگتراشی مصوّری۔ اور دیگر صنعتوں کے نمونوں سے پُر ہیں۔ جہاں کہیں لوگوں کے واسطے کھانے پینے کا سامان مہیّا کیا گیا تھا۔ وہاں خادم اور خادمہ خاص وردیاں پہنے تھے۔ جن کی کاٹ تراش اطالیہ کی وضع کی نقل تھی۔ احاطہ کی دیواریں رنگا رنگ کے پردوں کی بنی تھیں۔ جن پر اطالیہ کے قدرتی مناظر کے نقشے آنکھ کو دھوکا دیتے تھے۔ کہ وُہ سچ مُچ جنوب یورپ کے مناظر دیکھ رہی ہے۔ احاطہ کئی حصّوں میں منقسم تھا۔ جن میں سے بعض حصّے مسقّف

تھے اور بعض کھُلے۔ مسقّف حصّوں میں صنّاعی کی نمائش اور دوکانیں تھیں اور کھُلے حصّوں میں سیر تفریح کی باتیں۔ ایک صحن پھُولوں کی کیاریوں سے رشکِ گلشن بنا ہُوا تھا اور اس کے وسط میں بینڈ کے لئے جگہ تھی۔ جہاں مقررہ اوقات پر ہر روز باجا بجتا تھا اور موسیقی کے دلدادہ اس کے گِرد کُرسیوں پر بیٹھے باجا سُنتے رہتے تھے۔ مگر جو حصّہ اس نمائش کا مجھے سب سے دلچسپ معلوم ہوتا تھا وُہ ایک اَور صحن تھا۔ جو دو بلند عمارتوں کے درمیان واقع تھا۔ اور جس میں ایک خوبصورت حوض صاف پانی سے لبالب بھرا رہتا تھا۔ اِس حوض کے دونوں طرف ایک نہر سی بنی ہُوئی تھی اور اس کے وسط میں ایک کل تھی۔ جسے اُڑنے کی کَل کہتے تھے۔ اِس کی صُورت کا کچھ اندازہ مندرجۂ ذیل نقشے سے ہو سکیگا۔ کشتیاں سی جو

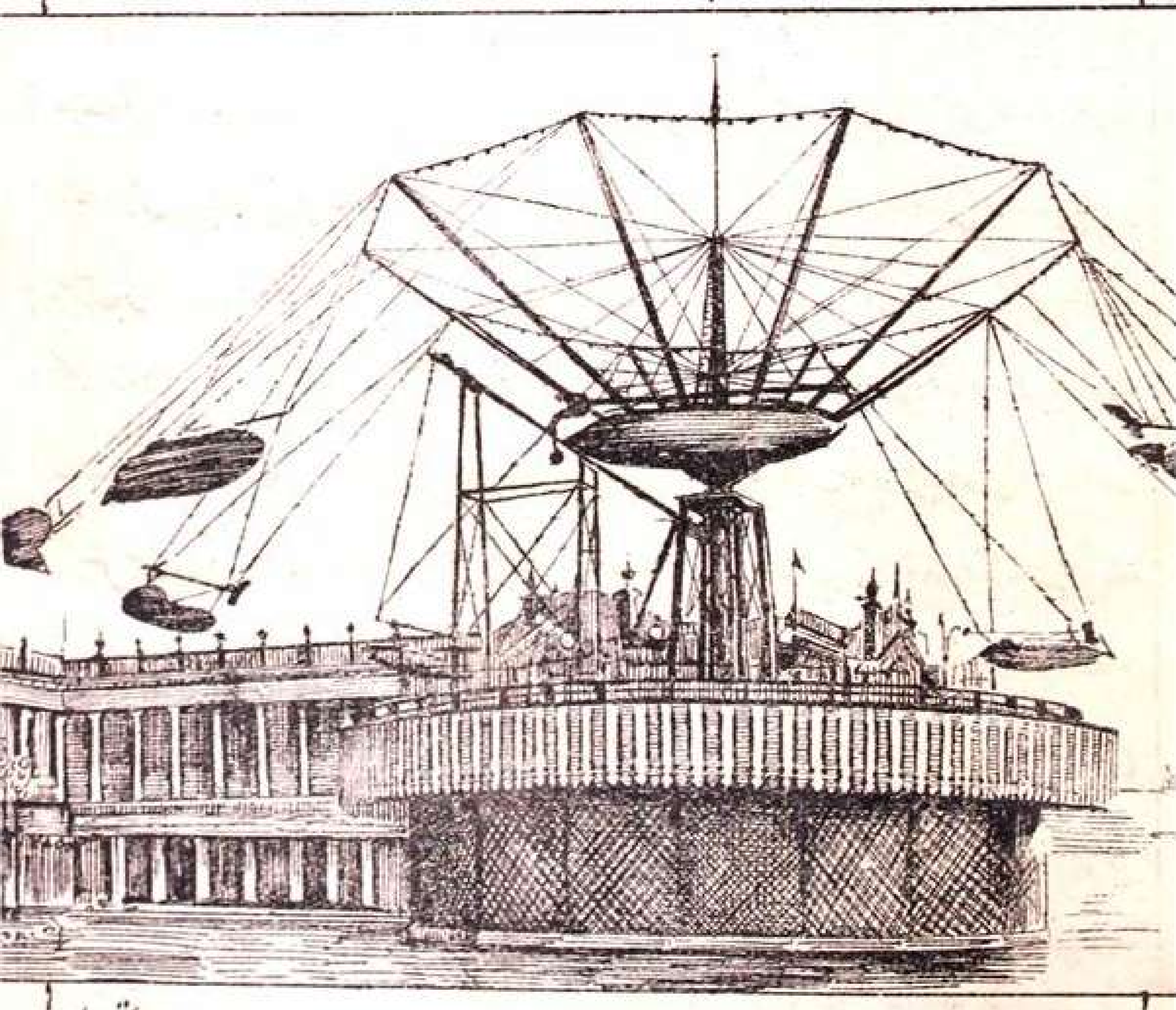

نظر آتی ہیں۔ ان میں لوگ بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کشتیاں نہایت مضبوط رسّوں سے آویزاں تھیں اور اُن تمام رسّوں کے سرے ایک بڑے ستون کے سرے سے لوہے کے حلقوں کے

ذریعے سے بندھے تھے۔ پستون دُخانی کل کے ذریعے سے گھومتا تھا تو ساری کشتیوں کو حرکت ہوتی تھی۔ یہانتک کہ چکّر کھاتے کھاتے ایسا درجہ آتا تھا کہ کشتیاں ہوا میں اُڑتی معلوم ہوتی تھیں اس کل کا اصُول بالکل وُہی تھا۔ جو اُن چکّروں کا ہوتا ہی جو ہمارے ملک میں عام میلوں پر موجُود ہوتے ہیں اور جن کے ذریعے سے کاٹھ کے گھوڑے جن پر شوقین لوگ سوار ہوتے ہیں۔ گھومنے لگتے ہیں۔ مگر اسی خیال کی ترقّی سے ایسی نفاست پیدا ہوئی تھی کہ اس مشین کو دُور سے چلتے دیکھنا نہایت ہی مزا دیتا تھا اور اس میں سوار ہونا اُس سے زیادہ دلچسپ تھا۔ اور اسی لئے نہ صرف تماشائیوں کا ایک گروہ کثیر اس کے گرد جمع رہتا تھا۔ بلکہ سوار ہونے والوں کا بھی ہجُوم ہوتا تھا اور میرا خیال ہے کہ سارے تماشوں میں یہی سب سے مقبُول تھا اور اس کے مالک کو سب سے زیادہ نفع ہوا۔ حوض کے وسط میں اس کا نصب ہونا اس کے لُطف کو دوبالا کرتا تھا اور رات کے وقت جب حوض پر چاروں طرف سبز و سُرخ شیشوں میں چراغ جلتے تھے اور سارے صحن میں روشنی ہوتی تھی تو اس مشین کی سیر عجب بہار دیتی تھی۔ اس پر بیٹھ کر گھومنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ رنگین روشنی کی مسلسل قطاریں چکّر لگا رہی ہیں ایک عجیب بات اِس کے متعلق یہ تھی کہ اس میں میمیں بکثرت سوار ہوتی تھیں۔ گو میں نے کئی مردوں کو اس سواری سے گھبراتے دیکھا اور یہ کہتے سُنا کہ خواہ کتنی ہی احتیاطیں کر لی گئی ہیں پھر بھی خطرناک ہی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں عورتیں عموماً بزدلی کی کمزوری سے خالی ہیں اور بہت سے مردانہ کھیل شوق سے کھیلتی ہیں۔ سمندر میں غوطے لگانا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنا ان کے لئے ایسا ہی آسان اور اُنکو اتنا ہی مرغوب ہی جتنا مردوں کو۔ مگر طرفہ یہ ہے کہ اِن کشتیوں میں سوار ہوتے وقت یا اور کسی ہنسی خوشی کے موقعے پر اظہارِ نزاکت سے بھی دریغ نہیں کرتیں اور کشتیوں کے چلتے ہی وہ چیخیں مارتی ہیں۔ کہ اگر چیخوں کے بعد فوراً قہقہے کی آواز تسلّی نہ دیدے تو سُننے والے ڈر جائیں کہ کوئی حادثہ ہو گیا۔

اس حوض کے پانی سے دو اور کام لئے گئے تھے۔ اس کے دونوں طرف نہریں

سی نکلتی تھیں - اُن میں سے ایک کے اختتام پر ایک ڈھلوان آہنی سڑک بنی تھی جس کے نیچے مضبوط لکڑی کی شہتیریوں سے ڈھلوان فرش بنایا گیا تھا - اس سڑک پر ایک پیتون والی کشتی بجلی کے زور سے چلتی تھی اور ڈھلوان سے زور شور کے ساتھ اُترتی ہوئی دھم سے پانی میں گرتی تھی اور گر کر جھاگ اُچھالتی ہوئی اُچھلتی تھی اور پھر نہر میں تیرتی ہوئی کنارے جا لگتی تھی - اس کا بھی ایک دھندلا سا نقشہ ہدیۂ ناظرین ہے - اس کھیل کو بھی قبولِ عام کا فخر حاصل تھا اور رونق

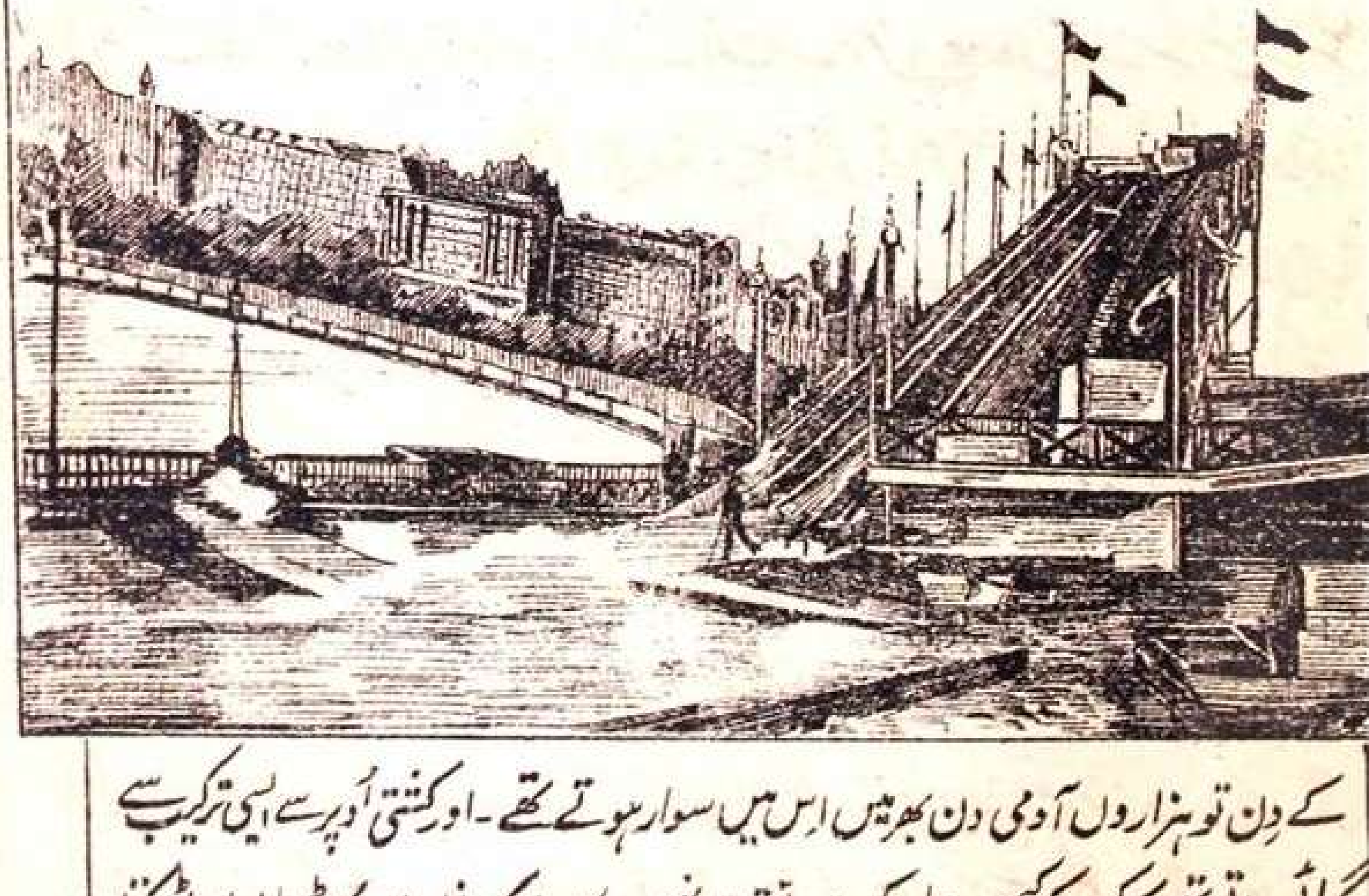

کے دِن تو ہزاروں آدمی دن بھر میں اس میں سوار ہوتے تھے - اور کشتی اُوپر سے ایسی ترکیب سے گرائی جاتی تھی کہ کسی کو کبھی دھماکے سے نقصان نہیں ہوا حالانکہ بظاہر اس کا ڈھلوان سے لڑھکنا ہوا آنا اور اور پانی میں گرنا سخت خوفناک معلوم ہوتا تھا - اسی نہر کے دُوسرے حصّے سے یہ کام لیا گیا تھا کہ وُہ ایک مصنوعی غار میں سے ہو کر گذرتا تھا - جو اطالیہ کی قدرتی غاروں کی نقل تھی - اور جس کے اندر لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ہوا آتے تھے - ان غاروں کو گروٹو کہتے ہیں اور ان کی

ساخت اس قسم کی ہوتی ہے - کہ کہیں کہیں روشنی کی شعاع اندر آگھستی ہے اور طرح طرح کے رنگ نظر آتے ہیں - اور کہیں بالکل تاریکی ہوتی ہے - سیّاح اِن غاروں میں بڑی خوشی سے گھستے ہیں - اِس شوق کو ایک چھوٹے پیمانے پر پُورا کرنے کا سامان یہیں کر دیا گیا تھا - اِسی سلسلے میں تھوڑی دُور ایک اَور جگہ تھی جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ مُلکِ اطالیہ کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر کسی جادو کے ذریعے سے لندن میں لا کر سجا دیا ہے - یعنی وہاں کے مشہور تاریخی شہر وینس کی نقل پیش کی گئی تھی - اِس مصنوعی وینس کے دروازے کے اندر جاتے ہی کیا نظر آتا تھا؟ جنوبی یورپ کا صاف نیلگوں آسمان - اُس پر بیشمار تارے - گلی کوچوں کی بجائے پانی کی نہریں رواں تھیں - جن میں کشتیاں چل رہی تھیں اور لوگ اُن میں بیٹھ کر دوستوں کو ملنے ایک گھر سے دُوسرے گھر جاتے تھے اور دوکانوں سے سودا سلف خریدتے تھے - کشتی والے اپنی دھن میں کچھ الاپتے جاتے تھے اور کشتی کو کھیتے جاتے تھے - مکانوں کا نقشہ ہُوبہُو وینس کا تھا اور وسطِ شہر میں ایک چوک تھا جہاں خاص اطالیہ کے گویّوں کی ایک جماعت وہیں کی زبان میں پیارے پیارے گیت گا رہی تھی - یہ ایسے گیت تھے جو ہمارے ایشیائی راگوں سے بہت ملتے - اور انگریزی طرزوں سے بالکل جُدا تھے -

اُڑنے کی مشین اور پانی میں گرنے والی کشتی کچھ اس نمائش کی خصوصیات میں نہ تھیں - کرسٹل پیلیس میں بھی موجود ہیں - مگر یہاں زیادہ اچھی بنائی گئی تھیں - لیکن گرد کی سیر اور وینس کا نقشہ یہ اسی کا خاص حصّہ تھیں اور کہیں اَور نظر نہ آسکتی تھیں - ان کے سوا ایک بڑی خصوصیت اس نمائش کی ایک بہت ہی بڑا پہیّہ ہے - جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ پیرس کے ایفل ٹاور کا جواب ہے - اس کی بلندی کا یہ حال ہے کہ اگر اُن گاڑیوں میں جو اس میں لگی ہیں بیٹھ جاؤ اور یہ گھمایا جاوے - تو جس وقت آپ انتہائے بلندی پر پہنچ جاویں تو لندن باوجود اپنی وسعت کے آپ کی آنکھ کی پتلی میں سما جائے - مگر افسوس ہے کہ یہ سیر بہت مقبول نہیں ہُوئی اور اس کثیر خرچ کے اعتبار سے جو اسکے بنانے میں اُٹھا ہوگا - مشکل معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے کو بہت فائدہ ہوا ہو - تاہم یہ پہیّہ بھی چلتا

ہی رہتا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ لوگ اس پر بھی سوار ہو ہی لیتے تھے۔ ایک دفعہ عجب تماشا ہوا۔ لوگ اس پر سوار تھے اور بیشتر اوپر کی طرف حرکت کر چکے تھے کہ پہیے کی کل بگڑ گئی اور حرکت بند ہو گئی۔ جو اوپر تھے وہ اوپر رہ گئے۔ اور چونکہ رات کو کل کی مرمت نہیں ہو سکی۔ اس لئے انہیں صبح تک آسمان اور زمین کے درمیان بے خواب و خور معلق رہنا پڑا۔ نقصان تو سخت نہ ہوا۔ کیونکہ خدا کے فضل سے جانیں بچ گئیں۔

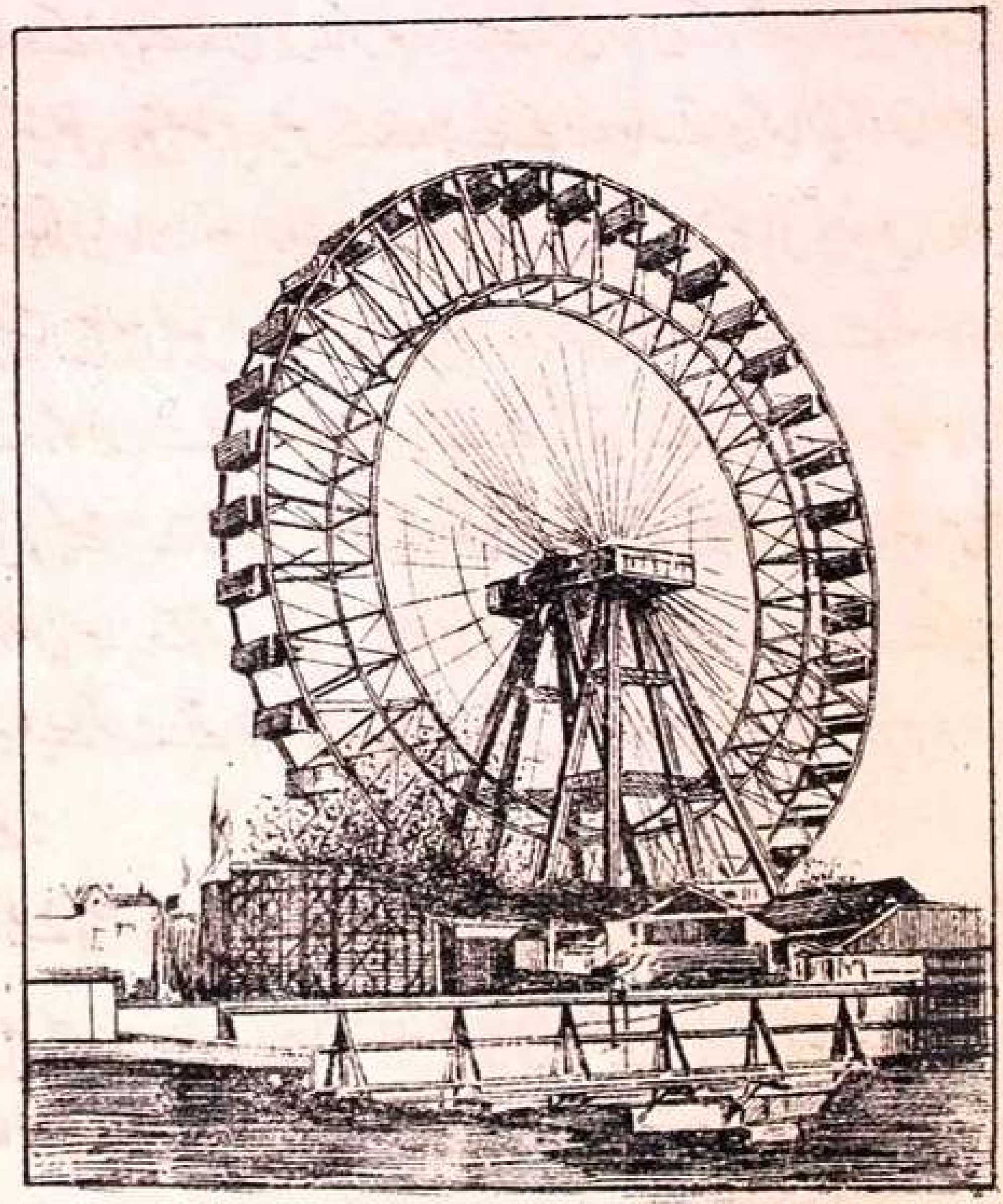

اور کمپنی والوں نے سب صاحبان کو پانچ پانچ پونڈ بطور ہرجانے کے نذر کیے۔ بعض لوگ تو ان میں ایسے تھے کہ انکی تکلیف کا یہ کافی معاوضہ نہ تھا۔ لیکن بہت سے ایسے تھے جن کے وسائل محدود تھے اور انہیں ایک رات کی تکلیف کے عوض میں ستر اسّی روپے مل جانا غنیمت معلوم ہوا۔ شہر بھر میں اس واقعہ کا کئی دن چرچا رہا۔ اور لطیفہ یہ ہوا کہ اس واقعے کے بعد بجائے پہیے کی طرف

رجوع کم ہونے کے چند دن تک ایک کثیر تعداد لوگوں کی اس میں سوار ہونے کو آتی رہی۔ اِس خیال سے کہ اگر پھر کوئی ویسی ہی دِقّت پیش آئے تو پانچ پانچ پونڈ ملیں۔ مگر نہ ایسی اُفتاد روز ہوتی ہے اور نہ ایسی رقم بے محنت آئے دن ہاتھ لگتی ہے۔

اس قسم کی بہت سی کھیل تماشے کی چیزیں تھیں۔ جن کے ذریعے سے ہزاروں پونڈ روز نمائش گاہ میں آتے تھے۔ مگر کچھ کھیل تماشے کی چیزوں پر ہی تماشا ختم نہ تھا۔ اِسی نمائش میں اطالیہ کی بندوقوں اور توپوں کے نمونے تھے۔ جن سے ملک کے اسلحہ اور اُس کی جنگی حالت کا پتہ چلے اِسی میں وہاں کی تصاویر تھیں۔ جن سے فنِ نقاشی کی ترقی کا حال کھلے۔ اِسی میں سنگ مرمر اور دُوسرے پتھروں کے خوبصورت اور سڈول بُت تھے۔ جو سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے کہلا سکتے تھے۔ اِسی میں لکڑی کا اچھا اچھا کام تھا۔ اور اسی میں اطالیہ کی دوسری صنعتوں کے نمونے دکھلائے گئے تھے۔ کہیں سوئیاں تیار ہو رہی تھیں۔ کہیں شیشے اور بلور کا کام دیکھنے والوں کے سامنے بنایا جاتا تھا۔ کہیں چکنی مٹی کے چھوٹے چھوٹے بُت ایک شخص اس خوبی سے منٹوں میں بنا کر رکھتا جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ غرض سارا میلا ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق تھا۔ اور اس کی بہت سی باتیں ایسی تھیں۔ جو قابلِ تقلید معلوم ہوتی تھیں۔ تاکہ ہم لوگ اگر میلوں کے بغیر گزارہ نہ کر سکیں اور فطرتِ انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید نہ کر سکینگے تو اتنا تو ہو کہ جو کچھ کیا جائے سلیقے سے کیا جائے اور اس میں کچھ فائدہ مدِّ نظر رکھ لیا جائے +

عبد القادر (از لندن)

چاند کا منظر

اس مضمون میں مَیں چاند کے خوفناک سین پر جو قوی دُوربین لگا کر دیکھنے سے محسوس ہوتا ہی اور انسان کے دِل پر عجب حیرت انگیز اور پُرہول اثر ڈالتا ہی ایک مختصر نظر ڈالتا ہُوں۔ دُوربین لگا کر چند ساعت نظر جمائے رہنے کے بعد چاند کا ہوش رُبا منظر جس کی خوفناک خاموشی دیکھ کر انسان اپنی ہستی کو بھُول جاتا ہی نظر آنا شروع ہوتا ہی۔ شادابی و سرسبزی کا کیا ذکر مُردار پہاڑوں کی بھُوت کی سی ہولناک صورت دکھائی دیتی ہی۔ ان پہاڑوں کا سلسلہ جن میں حیوانات و نباتات کی سکونت و پرورش کا کچھ پتہ نہیں چلتا دُور دُور تک سانپ کے بل کی طرح ایچ پیچ کھاتا ہوا پھیلتا چلا گیا ہی۔ اور ان کے بیچ بیچ آتش فشاں پہاڑ جن میں سیاہ کوئیں اور غار محسوس ہوتے ہیں اور جنکو دیکھ کر گیلی لیونے پرطاؤس کی آنکھوں سے تشبیہہ دی تھی۔ حلقہ حلقہ نظر آتے ہیں۔ غرض چاند میں پہاڑوں کا ایک گورکھ دھندا نظر آتا ہی۔ یہاں پر انسان کی حیرت زدہ نظر ٹھہر جاتی ہی اور وہ انکے باطنی حال دریافت کرنے کی بیکار کوشش کرتا ہی۔ پھر بیچارہ انسان مایوس ہو کر ظاہری سماں پر نظر دوڑاتا ہی اور قیاس و فکر سے کام لے لیکر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہی۔ کوئی مینار سیدھا مینار کی طرح کھڑا اور کوئی مخروطی شکل کا سربریدہ پیالے کی طرح مُنہ کھولے ہُوئے نظر آتا ہی۔ اِن پہاڑوں میں ایسے ایسے مہیب تاریک کنڈ اور پُرہول اندھیرے غار محسُوس ہوتے ہیں کہ اگر فاصلے کے ساتھ اطمینانِ قلب نہ ہوتا تو دیکھ کر انسان کا دم نکل جاتا۔ اِس خوفناک منظر کو دیکھتی بھالتی جب نگاہ پہاڑوں کی جڑ کی طرف جا پڑتی ہے تو عجیب و غریب وادیاں نظر آتی ہیں۔ جنہیں تمام حجر لشفہ یعنی لاوا کے سنگریزے اور کُل معدنیات کے منجملہ پرت محسُوس ہوتے ہیں اور یہ اس زمانہ بعید کی خبر دیتے ہیں۔ جس وقت چاند زمین کی طرح اک آباد سیارہ تھا اور اُس میں حرارت غریزی باقی تھی۔ جس کی وجہ سے چاند کے آتش فشاں پہاڑ جن کا ہیجان ٹھنڈا پڑ کر آج ہم دم بخود خاموش پاتے ہیں ہیجان اور جوش میں آتے تھے۔ چاند میں زلزلہ آتا تھا۔ اور آتش فشاں پہاڑوں سے خاکستر۔ خاک۔ انگارے غٹ کے غٹ بخارات۔ پگھلے ہُوئے معدنیات۔ جلتا ہُوا مائع مادہ گرمی کے بھبکتا ہُوا

بطنِ قمر سے جوش کھا کر اُبلتا تھا اور سینکڑوں کوس اک آگ کا دریا بہتا ہُوا چلا جاتا تھا جس کو آج ہم منجمد حالت میں مرا ہُوا زبان نکالے پاتے ہیں۔ اور زیادہ غور و تامل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جُوں جُوں چاند کی حرارت زائل ہوتی گئی اس کے ساتھ ساتھ آتش فشاں پہاڑوں کا جوش بھی کم ہوتا گیا اِس لیے کہ جو آخر وقت میں مادّہ اُبل کر پہاڑوں کی ڈھلان سے نیچے کو بہا ہے وُہ تھوڑی ہی دُور جاتے جاتے تھم گیا ہے۔

غرض اس حیرت انگیز سین کو دیکھ کر ہمارے دماغ میں خیالات کا ایک طُوفان اُٹھتا ہے اور چاند کے گذرے ہُوئے حالات کو جو زمانہ ماضیہ کی گہنگھور تاریکی سے آلودہ ہے جاننے کے لئے ہمارا جی تڑپ جاتا ہے اور بیساختہ ہماری زبان سے یہ مصرع نکلتا ہے۔

دَوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو (اقبال)

پھر جب قوتِ متخیلہ تھک جاتی ہے اور ہمارا ذہن ان خیالات کی طرف منتقل ہوتا ہے تو مایوس حیرت زدہ نگاہ دُوسری طرف جا نکلتی ہے اور چاند کے مشرقی بازو پر ایک بہت بڑا کھانچا نظر آتا ہے جس پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں اس کی گہرائی پچاسوں ہزار فیٹ تھی مگر اب وُہ پہاڑوں کی بڑی بڑی چٹانوں کے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے سے بھرتا جاتا ہے۔ اس کھانچے کے اندر جس کا پیٹ اندر سے اُبھرا ہُوا ہے سیاہی مائل سبزی نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بھیگے ہوئے پتھروں پر سبز سبز کائی جمی ہو۔ یہ دلفریب رنگ جس کو دیکھ کر ایک ٹکٹکی سی بندھ جاتی ہے ہم کو کسی کسی قسم کے نباتات کے وجُود کا گمان دلاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ خیال گذرتا ہے کہ پانی اور ہوا بغیر جس کے وجود کا چاند میں کوئی نشان نہیں ملتا نباتات کا پرورش پانا اور اسکا زندہ رہنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا خُوب کسی نے اس اعتراض کو دفع کرنے کے لئے اس بلا کے نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ممکن ہے کہ چاند میں کاربونک ایسڈ گاس جو آتش فشاں پہاڑوں سے ہیجان اور جوش و خروش کے وقت بخارات کے ساتھ کثرت سے خارج ہوتا ہے اور جو نباتات کو پرورش کرنے میں شیرِ مادر کا کام کرتا ہے اب تک موجُود ہو۔

یہ سوچتی سانچتی جب نظر دوسری جانب کو مڑتی ہے تو کوپرینکس جو چاند کا ایک شاندار عظیم آتش فشاں پہاڑ ہے ہماری نگاہوں کو اپنی اجنبی شکل کا تماشائی بنا لیتا ہے۔ اصل پہاڑ کے دو طرف دو چوٹیاں جن کی بلندی بارہ ہزار فیٹ کے قریب حساب کی گئی ہے۔ سیدھی مینار کی طرح سر بفلک کشیدہ نظر آتی ہیں اور اُن کے چاروں طرف ننھی ننھی آتش فشاں پہاڑیاں جن کے تنگ مخروطی کو دیکھ کر بھڑ کے چھتے کا گمان ہوتا ہے کثرت سے نظر آتی ہیں۔ کوپرینکس کے عجیب غریب کھنڈ کی دیواریں جس کے بیچ کی گنگھور خوفناک تاریکی دیکھ کر انسان کا دل بیٹھا جاتا ہے نیچے کی طرف بالکل سلامی دار نظر آتی ہیں۔ اِس کے ہوش ربا وادیوں کو دیکھنے سے یقین ہوتا ہے کہ کوپرینکس سے کئی صدیوں تک سوختہ و گداختہ جلتا ہوا سیال مادہ اس کثرت سے اُبل کھاتا رہا ہے کہ سینکڑوں کوس تک لاوا کی دھاریں بہتی چلی گئی ہیں اور تمام وادیوں کو ڈھانک دیا ہے۔ ان دھاروں کی لہریں جو اس وقت منجمد ہو کر سنگلاخ دیواریں بن گئی ہیں ایسا اُوپر تلے پیچ و تاب کھاتی ہوئی دُور تک پھیلتی چلی گئی ہیں کہ دیکھتے دیکھتے انسان کی نگاہ تھک جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں جابجا معدنیات کے اَن گڑھ میناروں کا جُھرمٹ نظر آتا ہے جن کی مخروطی چوٹیاں قطار کی قطار چاند کی آٹھویں تاریخ کے بعد سُورج کی کرن سے ایسا چمک اٹھتی ہیں کہ اُن کے دلفریب سلسلے پر موتیوں کی لڑی کا گمان ہوتا ہے۔

جس وقت چاند بدر بنجاتا ہے تو علاوہ اس سین کے جس کو میں اوپر لکھ آیا ہوں اک اَور نرالا اور انوکھا منظر دکھائی دیتا ہے۔ جس کی حقیقت دریافت کرنے میں ہماری عقل حیران رہجاتی ہے ذرا سا غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا چاند کے ایک کنارے سے دُوسرے کنارے تک سینکڑوں شعاع نُور کی ندیاں بہتی چلی گئی ہیں اور اُن سب کا مرکز خروج کسی نہ کسی آتش فشاں پہاڑ میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ٹائیکد نامی چاند کا ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جس سے ایسی ایسی نُور کی ندیاں بہت سی پیدا ہوئی ہیں اور ہر سمت میں دُور دُور تک بہتی چلی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک تو اتنی لانبی ہے کہ بلا مبالغہ اُس کی چمکتی ہوئی لہر کا نشان سترہ سو میل تک حساب کیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ان خیالی ندیوں کا بہاؤ عجب بلا کا بہاؤ ہے کہ پہاڑوں کے روکے بھی کہیں نہیں رُکا ہے۔ مُڑنے کا کیا ذکر جدھر رُخ کیا ہے بس اُسی طرف بڑے بڑے پہاڑ چٹان ناہموار وادیاں ٹیکرا غار کنڈ غرض جو کچھ سامنے راہ میں پڑا ہے سب کو صاف قطع کرتا ہوا نکل گیا ہے۔ دُوسری بات قابل نوٹ کرنے کے یہ ہے کہ جن پہاڑوں سے یہ شعاع نُور کی ندیاں نکلی ہیں وُہ پہاڑ بھی اِسی رنگ و رُوپ کے ہیں اور ان میں بھی ایسی ہی چمک دمک نظر آتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان پہاڑوں کی ترکیب میں بھی وُہی اجزا غالب ہیں۔ جن سے صانع قُدرت نے اِن چمکتی ہُوئی لہروں کو پیدا کیا ہے۔

اب یہ خیال کرنا چاہیئے کہ یہ نُور کی ندیاں جن کو ہم یہاں اس طرح لہراتے دیکھ رہے ہیں۔ آخر ہیں کیا چیز؟ اس گتھی کے سُلجھانے میں بڑی بڑی دماغی قوتوں نے کوشش کی ہے مگر آجتک ایسی نہیں سُلجھی جسے سُلجھنا کہتے ہیں۔ بعض نے یہ قیاس کیا ہے کہ یہ شعاعی لہریں سیال لاوا کی دھاریں ہیں جو بہتی بہاتی دُور تک چلی گئی ہیں اور اب مُنجمد ہو کر سُورج کی کرن سے چم چم چمکتی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح کا منظر ہم زمین پر موجود پاتے ہیں۔ اٹنا سے جس قدر جلتا ہُوا سیال مائع اُبال کھا کر نکلتا ہے وُہ آخر ندیوں کی صُورت ہر طرف بہتا ہُوا چلا جاتا ہے۔ چاند کا منجم اگر اپنی دُوربین لگا کر زمین کی سیر کرے تو اُس کو بھی یہ لاوا کی دھاریں جو اٹنا سے بہکر نکلی ہیں۔ چاند کی شعاع نُور کی ندیوں کی طرح چمکتی ہُوئی نظر آئینگی لیکن پھر تھوڑی ہی دُور کے بعد یہ ندیاں نظروں سے غائب ہو جائینگی۔ اور چاند کا منجم حیران ہوجائیگا اِس لئے کہ اٹنا سے جو لاوا کی دھاریں نکلی ہیں وُہ کوس دو کوس جاتے جاتے گھاس پات جنگل جھاڑیوں میں چھپ گئی ہیں اور جہاں کہیں پہاڑ اُن کے سدراہ ہو گیا ہے تو آگے بڑھنا کیسا وہیں پھیل کر ندی سے جھیل بن گیا ہے۔

اِس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ چاند میں جو شعاع نُور کی لہریں نظر آتی ہیں وُہ سیال لاوا کی دھاریں کسی طرح نہیں ہو سکتیں اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو وُہ پہاڑوں کے حائل ہونے سے چھوٹی موٹی

کی طرح وہیں کی وہیں رہجاتیں ۔ پہاڑوں کو کاٹتے ہوئے ناک کی سیدھ میں اُن کا اسی شان سے بہتے چلے جانا ہرگز ممکن نہ ہوتا ۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان لہروں کا لگاؤ محض سطحی نہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ پہاڑوں کی طرح جرمِ قمر کو پھاڑ کر وہ اندر سے نکلے ہیں ۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر آتش فشاں پہاڑوں کے تاریک کمنڈ میں بھی اُن کا نشان چمکتا دمکتا نظر آتا ہے ۔

ناسمتھ نے اس دلفریب منظر کی یوں تاویل کی ہے کہ جس طرح پولی مٹی کا گولہ دفعتاً گرم ہونے یا سرد ہونے میں چٹخ کر تمام سے شق ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح چاند کا کرہ جس وقت تازہ تازہ صانع عالم کے قدرتی کارخانے سے ڈھل کر نکلا تھا اور جلتا ہوا اک سُرخ انگارہ تھا اُس وقت اپنے جرم کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے جلدی جلدی ٹھنڈا ہونے میں تمام سے شق ہوگیا اور دراڑوں کی راہ سے اندر کا جلتا ہوا سیال مائع باہر اُبل آیا ۔ لیکن چونکہ اُوپر کی جمی ہوئی پرت ابھی بالکل ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے یہ سیال مائع باہر نکلتے ہی فوراً جم نہ سکا بلکہ عرصے تک اُسی طرح رقیق حالت میں رہا اور تمام پھیل پڑا ۔ یہ قیاس کچھ ایسے ٹھکانے کا معلوم ہوتا ہے کہ شعاعِ نور کی لہروں میں جن کو مَیں اُوپر بیان کر آیا ہوں ۔ ارتفاع کا نہ ہونا جس کی وجہ سے ان کا سایہ نہیں پڑتا اور پھر ان لہروں کے جا بجا زیادہ پھیلے ہوئے نظر آنے کا سبب پورا پورا فوراً ہی سمجھ میں آجاتا ہے ۔ اور یہ بات بھی کسی حد تک ممکن معلوم ہوتی ہے کہ چاند میں پہاڑوں کی خلقت شعاعِ نور کی لہروں کے پیدا ہونے کے ہزاروں ہزار لاکھوں لاکھ برس پیچھے ہوئی ہے +

سید راحت حسین
(از بھاگلپور)

ناظرین مخزن

یہ سنکر بہت خوش ہونگے کہ سرجن لفٹنٹ کرنیل جارج رنکنگ صاحب ایم - ڈی - آئی - ایم - ایس - سکرٹری بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ ان دنوں ایک اعلی قسم کی انگلش ہندوستانی ڈکشنری کی تصنیف میں مشغول ہیں - جسکی واقعی ملک میں سخت ضرورت تھی - جس قدر لغت کی کتابیں پہلے موجود ہیں وہ ایسی جامع نہیں جیسی یہ ثابت ہوگی - کرنیل صاحب ممدوح کا نام ایسا نہیں جو ہندوستان کے علمی دائرے میں غیر مانوس ہو - السنہ مشرقی کے ایک ایسے ماہر شخص کے قلم سے نکلنا ہی اس کتاب کی خوبی و عمدگی کی کافی دلیل ہے - کیا انگریزوں اور کیا ہندوستانیوں - کیا مبتدیوں اور کیا امتحانات کے امیدواروں کیا یورپین سیاحوں اور کیا ہندوستانی تاجروں غرض سب کے لئے یہ یکساں طور پر مفید و کارآمد ثابت ہوگی - دراصل کرنیل صاحب نے ایسی ڈکشنری تصنیف فرماکر ہمارے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے - اس ڈکشنری میں انگریزی لفظ کے معنے پہلے اردو حروف میں دئیے ہیں - پھر رومن میں - اگر کسی لفظ کے مختلف معنی ہیں تو انگریزی میں اس کے مختلف معنوں کو الگ الگ لکھ کر ان کے جداگانہ اردو معنی بیان کئے ہیں - ہر ایک لفظ کی تذکیر یا تانیث بھی لکھ دی ہے اور مشکل ترکیبوں کو مثالیں دیکر واضح کر دیا ہے - یہ ڈکشنری عنقریب تیار ہوجائیگی قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے عہ ۵ ہے - درخواست بنام مسرس تھیکر سپنک اینڈ کو کلکتہ ہونی چاہئے

ریویو

الکاشف:- اس نام کا ایک ماہواری رسالہ ہمارے دوست قاضی حمید الدین صاحب پروفیسر اوف آرٹس نجیب آباد کالج کوٹہ سے نکلا ہے اس رسالہ کا مقصد علوم و فنون کو ترقی دینا ہے - اس میں علمی دلچسپیاں مہیا کرنیکے علاوہ سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مفید آرٹیکل لکھے جاتے ہیں - قاضی صاحب نے ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنیکا بیڑہ اٹھایا ہے - ہم چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے ارادے میں ہر طرح سے کامیابی ہو اور یہ رسالہ ملک کیلئے بہت مفید ثابت ہو قیمت سالانہ ۱۲ اار لکھائی چھپائی عمدہ - درخواست بنام ایڈیٹر صاحب ہو -

علمی جنتری سنہ ۱۹۰۵ء

اس مفید اور کارآمد جنتری کو سید محمد عبد اللہ صاحب عالم نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیکر شائع کیا ہے - اس جنتری میں علاوہ اور مفید باتوں کے تاریخی معلومات اور مشاہیر عہد کے حالات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں - قیمت اسکی غالباً ۲ار ہے - اور درخواست کرنے پر سید محمد عبد اللہ صاحب عالم سوداگر چرم کانپور سے مل سکتی ہے

سپاس جناب امیر رضؓ

ذیل کی نظم درج کر کے آج ہم اُن احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لئے اکثر دفعہ بے حد اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم باظہارِ عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔

اے محوِ ثنائے تو زبانہا — اے یوسفِ کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبّت — اے نوحِ سفینۂ محبّت
اے ماحیِ نقشِ باطلِ من — اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سرِّ خطِ وجوب و امکاں — تفسیرِ تو سورہائے قرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے — اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سرِّ نبوّتِ محمّد — اے وصفِ تو مدحتِ محمّد
گردوں کہ برفعت ایستادست — اے بامِ بلندِ تو فتادست
ہر ذرّہ درگہت چو منصور — در جوشِ ترانۂ انا الطور
بے تو نتواں باو رسیدن — بے او نتواں بتو رسیدن
فردوس ز تو چمن در آغوش — از شانِ تو حیرت آئینہ پوش
جانم بغلامئ تو خوشتر — سر برزدہ ام ز جیبِ قنبر
ہشیارم و مستِ بادۂ تو — چوں سایہ زپا فتادۂ تو
از ہوش شدم مگر بہوشم — گوئی کہ نصیریٔ خموشم
دانم کہ ادب بہ ضبطِ راز است — در پردۂ خامشی نیاز است
اما چہ کنم مے تولا — تند است بروں فتد زمینا

زاندیشۂ عاقبت رہیدم
جنسِ غمِ آلِ تو خریدم

فکرم چو بجُستجو قدم زد   در دَیر شد و درِ حرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم   دامن چو گردباد چیدم
در آبلہ خارہا خلیدہ   صد لالہ تہِ قدم دمیدہ
اُفتادہ گرہ بروئے کارم   شرمندۂ دامنے غبارم
پویاں بے خضر سُوئے منزل   بردوش خیال بستہ محمل
جویائے مے و شکستہ جامے   چُوں صبح بباد چیدہ دامے
پیچیدہ بخود چو موجِ دریا   آوارہ چو گردبادِ صحرا
وا ماندہ ز دردِ نا رسیدن   در آبلہ شکستہ دامن
عشقِ تو دلم رُبود ناگاہ   از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہ ز ہستی و عدم ساخت   بُتخانۂ عقل را حرم ساخت
چُوں برق بخرمنم گذر کرد   از لذّتِ سوختن خبر کرد
برباد متاعِ ہستیم داد   جامے ز مے حقیقتم داد
سرمست شدم ز پا فتادم   چوں عکس ز خود جُدا فتادم
پیراہنِ ما و من دریدم   چُوں اشک ز چشم خود چکیدم
خاکم بفراز عرش بُردی   زاں راز کہ با دلم سپُردی
واصل بکنار گشتیم شد   طوفانِ جمال زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم   پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم گریم تپم گدازم

محمد اقبال

شعرائے قوم کو خطاب

یہ مختصر نظم ہمارے مکرّم جناب عزیز میاں محمد شاہ دین صاحب بیرسٹرایٹ لا متخلّص بہ ہمایوں کی فکر رسا کا ایک تازہ نتیجہ ہے۔ چونکہ اس نظم کا مضمون نہایت غور طلب اور نتیجہ خیز ہے اور شعرا کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اِس لئے ہم خاص شکریئے کے ساتھ اس قابلِ قدر نظم کو درج کرتے ہیں

نالوں سے کوئی چرخ کو چکّر میں لائے کیوں
سینے میں دل کو رکھ کے کرے ہائے ہائے کیوں

اے بوالہوس فسانۂ عشق اب تو کر تمام
الفاظ خشک پر کوئی آنسو بہائے کیوں

زندہ دلی تمہاری مُبارک رہے تمہیں
آتا نہیں یہ دل جو بتوں پر تو آئے کیوں

کرتی نہیں ہے جن پہ اثر داستانِ حُسن
پھر یہ سبق اُنہیں کوئی ازبر پڑھائے کیوں

ہر سمت جبکہ آگ لگی ہو تو میرِ بزم
پروانے اور شمع کا قصّہ سُنائے کیوں

جذباتِ دِل کو کیوں ہو تصنّع سے کچھ بھی لاگ
بُت کو خدا بنا کے کوئی سر جھکائے کیوں

مر کر بنا کرے کوئی کب تک غبارِ راہ
اِس اپنی مُشتِ خاک کا خاکا اُڑائے کیوں

مثلِ پسند کون ہَوا میں اُڑا کرے
دامِ خیال میں کوئی گردن پھنسائے کیوں

قُمری کی طرح کیوں کوئی کُو کُو کیا کرے
آزاد دل کو سرو کا بندہ بنائے کیوں

اَے ہم نوا چمن کی ہَوا ہی بدل گئی
مدّت سے طرزِ نغمہ سرائی بدل گئی

یہ چہچہے خزاں میں کوئی کیوں سُنا کرے
گُل ہی نہ ہو تو بُلبلِ شیدا کو کیا کرے

بجلی نے جبکہ اپنا نشیمن جلا دیا
رنگِ چمن پہ کون دل و جاں فدا کرے

چمپا نہیں گلاب نہیں موتیا نہیں
گلچیں سُوکھی شاخوں سے پتّے چُنا کرے

پروانہ وار کیوں ہو نثارِ چراغِ حُسن
موہُوم غم کی آگ میں دل کیوں جلا کرے

جمتا نہیں ہے اب تو یہ رنگ اختلاط کا — کب تک گلے نسیم کے نکہت ملا کرے

خوں پانی ہو کے خشک خزاں میں ہوا تو کیوں — دعوئ شہید ہونے کا برگِ حنا کرے

آہٹ خزاں کی جس نے چمن میں سُنی نہیں — ہاں بیٹھ کر وہ نغمۂ بلبل سُنا کرے

اے ہم صفیر حالتِ گل اب یہ ہے کہ تو — شاخِ شجر سے نوحۂ ماتم بپا کرے

برباد ہوتا دیکھے چمن کو جو باغباں — پھر تیرے دلفریب ترانوں کو کیا کرے

وہ گیت گا کہ باغ میں بس جان ڈال دیں
اور صحنِ بوستاں سے خزاں کو نکال دیں

اے شاعرانِ قوم زمانہ بدل گیا — پر مثلِ زلفِ یار تمہارا نہ بل گیا

پیٹو گے کب تلک سرِ رہ تم لکیر کو — بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا

دیوانہ وار بیٹھے ہو سینوں پہ رکھ کے ہاتھ — یہ کس کا ہاتھ سب کے دلوں کو مسل گیا

آخر ہر ایک دل کو ہے اُلفت سے کچھ تو لاگ — کیا اک تمہیں پہ عشق کا جادو ہی چل گیا

یہ کیا غضب کہ ڈوب گئے سات آسماں — آنسو تمہاری آنکھ سے گر اک نکل گیا

روشن ہوئے ہیں نورِ بصیرت سے دو جہاں — سوتے ہیں کوئی آنکھوں پہ گر پاؤں مل گیا

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی — دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اِک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح — اِک وہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا

ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے — گر گر کے ملکِ ہند کچھ آخر سنبھل گیا

دن گذرا پر تمہاری وہی ایک بات ہے
سر پر کھڑی وہ دیکھو قیامت کی رات ہے

اے نوجوانو! آؤ کہ کچھ کر دکھائیں ہم — طرزِ قدیم شعر و سخن کو مٹائیں ہم

دِل کے بتوں کو توڑ کے فطرت پرست ہوں — نامِ خدا پہ کعبے میں ایمان لائیں ہم

لفظوں کا جادو چھوڑ کے ہوں معنی آفریں — فکرِ رسا کے خوب کرشمے دکھائیں ہم

اِک طرح دلفریب کی بُنیاد ڈال دیں — اور دل سے محو کر دیں وُہ اگلی ادائیں ہم
آئینِ نَو کو سیکھیں اس عہدِ جدید میں — بوسیدہ ہو گیا ہے جو دفتر جلائیں ہم
رنگِ چمن کچھ اَور ہے شیخ کی بُو کچھ اَور — گل کو نئی بہار کے نغمے سُنائیں ہم
ہندوستان میں ایک نئی رُوح پھُونک دیں — جو قوم مُر چکی ہے اُسے پھر جِلائیں ہم
ایسے برس پڑیں کہ ہو شاداب مُلکِ ہند — حُبِّ وطن کی کالی گھٹائیں اُٹھائیں ہم
کیا خُوب ہیں خیال ہمایُوں صد آفریں — لیکن خفا نہ ہو تو تمہیں سچ بتائیں ہم

جو کچھ لکھا ہے اس میں اثر کا مزا نہیں
ناصح جو بے عمل ہو کسی کام کا نہیں

محمد شاہ دِین

سپُوت بیٹا

آتا ہے ہند سے تو اَے نوجوان سپاہی — مجھ کو بھی کچھ بتا جا - رکھے تجھے الٰہی
اُنیسویں کی پلٹن ہے اِک وہاں بہادر — جس کا ہر اک سپاہی مشہور ہے دلاور
کچھ اُن کا حال کہنا اور مجھ کو یہ بتانا — کیا ہیں وُہ سب سلامت اور خرّم و توانا
بیٹا مرا ہے اُن میں - میرا عزیز لڑکا — جس کی ہے سب سے بڑھکر دُنیا میں - مجھکو پروا
احساں کرے گا ماں پر اُس کی خبر بتا کر
لے رانڈ کی دُعائیں اُس کی خبر سُنا کر"
آتا ہُوں ہند سے مَیں - موجُود جنگ میں تھا — حِصّہ مرا بھی اُس جا تیر و خدنگ میں تھا

اُنیسویں جو پلٹن ہے خوب جانتا ہُوں — اُس کے سپاہیوں کی جُرأت کو مانتا ہُوں
افسر ہوں یا سپاہی سب سے مُجھ میں شناسا — ہمراہیوں سے اپنے ہر اک ہے دوست میرا

لایا پیام ہُوں اِک تیرے لئے بڑی ماں
رابرٹ کا ترے پیغام - خوش خوش سُنو بڑی ماں"

"رابرٹ کو مرے تم کیا پہچانتے ہو بیٹا؟ — سچ سچ بتانا جو کچھ تم جانتے ہو بیٹا
آئے نیک خو سپاہی اُس کا پیام کیا تھا — کہنا اُسی کے الفاظ - اُس کا کلام کیا تھا
ہائے - وہ لفظ کہنا جو اس کے منہ سے نکلے — لختِ جگر کے میرے جو اپنے مُنہ سے نکلے
تجھ کو خبر نہیں وُہ - کیسا مجھے ہے پیارا — اپنی ضعیف ماں کی ہے - آنکھ کا وُہ تارا
فُرقت میں اُس کی ماں کا کیا حال ہو رہا ہے
یہ دل مرا غموں سے - پامال ہو رہا ہے"

"ہیولاک کی لڑائیاں اُس نے لڑی ہیں ساری — دُشمن یہ وار سارے اُس کے ہُوئے ہیں کاری
دو بار لکھنؤ پر وُہ چڑھ کے خوب اُڑا ہے — تلوار سے لڑا ہے اور توپ سے لڑا ہے
کر شُکر اُس خُدا کا جس نے اُسے بچایا
ہر معرکے میں اُس پر حق کار رہا ہے سایا"

صد شکر یا الٰہی - طاقت نہیں زباں کی — تُو نے سُنی دُعائیں اُس کی غریب ماں کی
اَے دو جہاں کے مالک اَے کردگار میرے — اس رانڈ ناتواں کی سُن لی - نثار تیرے
گولے کی زد سے روکا تلوار سے بچایا — اپنے کرم کا نقشہ دِل پر مرے جمایا
پر ہاں مجھے بتا دے پیغام اُس کا کیا تھا
اپنی ضعیف ماں کو کہنے کو کیا کہا تھا"

"اَے ماں بہادری سے تیرا لڑا ہے لڑکا — اور ہر زباں پہ اُسکا پھیلا ہوا ہے چرچا
کرنل کی جان کو اُس نے رن میں بچا لیا تھا — سرکار میں یہ قصّہ سارا لکھا گیا تھا

اس کے صلے میں اس کو تمغہ عطا ہوا ہے زاید برآں وظیفہ اس کو دیا گیا ہے

ہے خوش نصیب لڑکا تیرا بہت بڑی ماں
خوش قسمتی کا اسکی تارا رہے درخشاں

اے نیکدل سپاہی تیری زباں پہ رحمت جس خانداں سے ہے تو اُس خانداں پہ رحمت
اے پیارے[ع] مرنے والے تو کاش آج ہوتا اس میرے جھونپڑے میں کیا رنگ راج ہوتا
دکھ درد جو سہے تھے سب محو ہو گئے ہیں سالوں کے رنج و غم کو یہ لفظ دھو گئے ہیں
پر ہاں ابھی تو باقی کچھ پوچھنا تھا تم سے حالت تھی اس کی کیسی اور کیا کہا تھا تم سے

رابرٹ کا حال کیا تھا اور رنگ و روپ کیا تھا
للہ مجھے بتا دو تم سے جو کچھ کہا تھا"

سرخی سے اس کی رنگت تانبا سی ہو رہی ہے داڑھی نکل کے خوبی عارض کی کھو رہی ہے
ایسا بدل گیا ہے وہ نازنیں شمائل پہچان اس کی اماں تم کو بھی ہو گی مشکل
مرد جوان کیا ہے ہم نے تمہارا بچہ دل اس کا پر وہی ہے ہرگز نہیں ہے بدلا
رکھتا ہے یاد تجھ کو۔ کرتا ہے تیری باتیں اور جانتا نہیں ہے وہ ایسی ویسی باتیں

لیکن جہاز اُس کا سمجھو لگا کنارے
جلدی ہی خود ملیگا وہ آکے تم کو بارے"

تیں سچ مچ آ رہا ہے سچ مچ ملے گا مجھ کو؟ کب میرا پیارا ننھا دیدار دے گا مجھ کو
تم نے کہا تھا جلدی آیا وہ چاہتا ہے" جھوٹا نہیں میں اماں سچ مچ وہ آ چکا ہے"

"او میرے پیارے رابرٹ! اماں تمہارے واری"
"او ماں میں تیرے قرباں۔ حق نے سنی ہماری"

عبد الرشید چشتی مرحوم

ع خاوند سے مراد ہے جو مر چکا ہے ۱۲

بھونرا

بھونرا لوبھی پھول کا کلی کلی رس لے　　(ہندی دوہرا)

طائرِ خوش خبر[عہ] ہے نام مرا
اُلفتِ حُسن ہے پیام مرا

مری لبتی ہے پھول کی خوشبو
غنچہ و گل کی دید کام مرا

وادیٔ کوہ سیرگاہ مری
باغ مسکن ہے صبح و شام مرا

نہیں کس گل سے رسم و راہ مری؟
سب پہ پھیلا ہوا ہے دام مرا

پھول پھولے نہیں سماتے ہیں
مسکراتے ہیں سُنکے نام مرا

جتنے یہ کج کلاہ غنچے ہیں
جُھک کے لیتے ہیں سب سلام مرا

مانتے ہیں صنوبر و شمشاد
سرو آزاد ہے غلام مرا

بادۂ اُنس کا نشہ ہو مجھے
مَے اُلفت سے پُر ہے جام مرا

حُسن کو ڈھونڈھتا ہُوں ہر گل میں
ذوقِ دید اس قدر ہے عام مرا

جستجوئے گل است ہستیٔ من
ہوشیاری نثار مستیٔ من

شاہدِ گل کا حُسنِ جاں پرور
کوئی دیکھے گا مجھ سے کیا بڑھکر؟

ابھی اس کے جمالِ رعنا تک
نہیں پہونچی نگاہِ ذوقِ نظر

ابھی اس بھینی بھینی خوشبو سے
نہیں مہکا مشامِ بادِ سحر

ابھی اس پیارے پیارے چہرے کو
نہیں دھویا ہے اوس نے آکر

اس کی شہرت کا چار سُو پیغام
نہیں لے کر گئی نسیمِ سحر

عہ ذوق ۔ ؎ بلا سے ہو وے مرا مرغِ نامہ بر بھونرا ۔ کہ اسکو دیکھ کے وہ منہ سے خوش خبر تو کہے ۱۲

حالِ پر عندلیبِ نالاں کے — نہیں کی اُس نے مُسکرا کے نظر
اس دلاویز حُسنِ زیبا کی — نہیں گلچیں کو خواب میں بھی خبر
مَیں ہُوں اس حال میں بھی گُل سے قریں — ہیں عنایات اس قدر مجھ پر
ہم نفس ہُوں انیس و محرم ہوں — میری اُلفت میں اس قدر ہے اثر

جملہ آرائے خلوتستم من
بزم پیرائے جلوتستم من

دادِ گلگشت دے رہا ہُوں مَیں — محوِ ہر رنگ و ہر ادا ہُوں میں
پیار کرتا ہُوں جا کے گیندے کو — مُنہہ بنفشہ کا چُومتا ہُوں مَیں
آنکھ نرگس سے جا لڑاتا ہُوں — مائلِ چشمِ فتنہ زا ہُوں مَیں
لگ چلا ہنس کے سیوتی سے کبھی — کبھی چنبیلی سے جا ملا ہُوں مَیں
کبھی جُوہی سے چھیڑ کر بیٹھا — دِل لگی میں کوئی بلا ہُوں مَیں
یاسمن سے ہے میری سرگوشی — موتیا سے سخن سرا ہُوں مَیں
ہے نسیمِ سحر سے یارانہ — رازدارِ دلِ صبا ہُوں مَیں
دِل دُکھاتا نہیں کسی کا کبھی — رہروِ جادۂ صفا ہُوں مَیں
سرِّ خُذ ما صفا سے واقف ہُوں — علمِ دع ما کدر پڑھا ہُوں مَیں

دلم از نورِ مہر معمور است
رسمِ بیگانگی ز من دُور است

فنِ نظارہ میں ہوں مَیں یکتا — سب کو لازم ہے اقتدا میرا
مجھ سے اہلِ نظر یہ گُر سیکھیں — مَیں ہُوں ذوقِ سلیم کا پُتلا
حُسن سے مجھ کو ہے لگاؤ مگر — دِل کسی پھول کو نہیں دیتا
روگ دِل کو نہیں لگاتا مَیں — گو مے شوق کا ہُوں متوالا

میرا مطلوب ہر جگہ موجود میرا محبوب ہر طرف پیدا
نہیں میرا مثالِ بلبلِ زار شیوہ کار جھینکنا رونا
گُل کو نفرت نہیں دلاتا ہَیں شوق اپنا جتا کے حد سے سوا
نہیں مَیں زید و عمرو کا پابند یَں مقید ہُوں دامِ اُلفت کا
ہے ہر اک گُل نگاہ میں میری شوخ سے شوخ سادہ سے سادا

در تصوّر چہ انجمن دارم
جلوۂ گُل چمن چمن دارم

نیرنگ

"اے ہمصفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے"

مَیں کیا کروں جو نکلیں نالے بھی میرے موزوں موزونیٔ طبیعت اک دین ہے خُدا کی
مُرغِ قفس ہُوں گھبرا گھبرا کے چیخ اُٹھا ہوں فرصت کہاں ہے مجھ کو نغمے کی اور صدا کی
شاعر ہُوں مَیں نہ حاشا شاعر کا ہوں ٹوسی ہاں مشق کر رہا ہُوں فریادِ بے صدا کی
کیوں عشق کا لگاؤں مَیں روگ اپنے جی کو اور کیوں کروں مسیحا سے التجا دوا کی
انسان آپ حُسنِ انسان پہ ہو عاشق یہ عاشقی نہیں ہے نخوت ہے انتہا کی
اور ہو بھی تو نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دل ہیں سو خار کی خلش ہے کاوش ہے خارِ پا کی
معشوق کو کس عاشق نے پاک دل سے چاہا کِس مہ جبیں نے اپنے جانباز سے وفا کی
کیا عاشقی یہی ہے لکھا کروں قصیدے تعریف میں حیا کی انداز کی ادا کی

میں ننگ جانتا ہوں مضمون ناف و پستاں تفضیح اور اپنے محبوب دلربا کی
ہے مجھ کو وصل و ہجراں دونوں میں ایک لذت فرقت سے ہوں نہ نالاں قسمت کا ہوں نہ شاکی
اے عاشقو بتاؤ دل کیا ہوا تمہارا؟ اے مرنے والو تم نے جان عزیز کیا کی
اے مے کشو تم اتنی کیوں پی گئے کہ اب تم؟ بیخود پڑے ہوئے ہو سر کی خبر نہ پا کی
اے گلبنِ سخن کے دیرینہ باغبانو دیکھو بہار میرے صحرائے پُرفضا کی
قدرت کے پاک ہاتھوں سے یہ چمن لگایا شاہد ہے اس پہ بلبل کے آنسوؤں کی پاکی
اس پاک صاف گلشن میں آہ ایک کویل تانیں ٹھہر ٹھہر کر لیتی ہے کس بلا کی
ہر چند کوک اسکی سیدھی سی اک صدا ہے تاثیر اس صدا میں لیکن ہے انتہا کی
قانونِ تار و پودِ قدرت کا بج رہا ہے اور بہ رہا ہے نغمہ امواج میں ہوا کی
جنبش سے شاخ گل کی ہے شکل وجد پیدا پتوں کی تالیوں میں ہے شان مرحبا کی
اے شاعرو تمہاری قوال گائیں غزلیں محفل میں اور گونجے آواز واہ وا کی
یہ لذتِ مسرت تم کو رہے مبارک میں نے خوشی سے تم کو بخشی تمہیں سبا کی
رقت اٹھے[1] "آہے آہے" پر ہو تمہیں کو مجھ کو سودا نہیں کہ ناچوں آواز پر درا کی
میں شورش جہاں سی خود دور بھاگتا ہوں پروا نہیں ہے مجھ کو تحسین و مرحبا کی
اس شاعری میں مجھ کو بتلاؤ ملگیا کیا؟ شاہ دکن نے کوئی خلعت مجھے عطا کی؟
ہاں پاگیا بہت سے میں ہمخیال اپنے میرے لئے بہت کچھ نعمت ہے یہ خدا کی
دن رات میری پرنم آنکھوں میں پھر رہی ہیں دیرینہ صحبتیں ان دیرینہ آشنا کی
جو دور کالے کوسوں سے کان میں لگا کر آواز پر وطن کے مرغانِ خوشنوا کی
فونوگراف میں جو بھر بھر کے لے گئے ہیں یہ خوشگوار آہیں نادرسخن سرا کی
اور آہ وہ جوانی کی نیند سونے والے جو بیخبر پڑے ہیں آغوش میں فنا کی

[1] "آہے آہے" محفل حال و قال میں قوالوں کی وہ صدا جس پر وہ زیادہ زور دیکر گاتے ہیں۔

جب یاد آ گئے ہیں آنسو نکل پڑے ہیں ... اور ہاتھ اُٹھا کے میں نے اُن کے لئے دُعا کی

"اے ہمصفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے"
اِک فرد ہاتھ میں ہے یارانِ باصفا کی

نادر علی خان نادر

خیالاتِ منظوم

(بُری صحبت)

شریفوں کے بچے بُری صحبتوں میں ... جہاں تک ہو امکان ہرگز نہ بیٹھیں
یہ مانا کہ ہیں صاحبِ عزم وہمت ... ہمیشہ وہ محفوظ رکھینگے عصمت
اگر کچھ نہیں اور بدنام تو ہیں ... مگر بد سے بدتر ہیں بدنام جو ہیں
سفید اُن کی ناموس کی ہے جو چادر ... ابھی گو یا رکھی ہے دھوبی نے لاکر
یہ ممکن نہیں گو بچائیں وہ ازبس ... بجز داغ کے صاف لے آئیں واپس
سفیدی میں میل اور دھبہ ذرا سا ... نظر آئے گا دُور سے بدنما سا
یہ ہے ذکر اُن کا قوی ہیں جو دل کے ... مگر ہیں جوان میں طبیعت کے بودے
کہاں ہے علو ہمتی ان میں رکھی ... وہ پھنس جائینگے شہد میں جیسی مکھی
جو سمجھائے گا اُنکو سمجھینگے دشمن ... قریبوں سے ہو جائیگی سب سے اَن بن
نشہ عیش و عشرت کا جائیگا چڑھتا ... غرض انہماک ان کا جائیگا بڑھتا
نکلنے کا خود بھی کریں گر ارادہ
نکلنا تھا کیسا پھنسینگے زیادہ

(ترقی کی کیفیت)

یہ اکبر سے پوچھا خداوندِ عالم — قناعت فتوحات سے کب کروگے؟
کہا اُس نے قائم نہیں دہر میں کچھ — جو بڑھنے سے ٹھہرے تو اُلٹے پھروگے
مگر قولِ عارف ہے اس سے بھی بڑھکر — نہ مانا گر اس کو مصیبت بھروگے
کہ دُنیا میں اب دورِ بائی سکل ہے — جو اِک لحظہ ٹھہرے تو فوراً گروگے

پیرزادہ محمد حسین عارف

ایک ناکام بیرسٹر کا انجام

ٹائی خوب ہی باوا کی دولت ہم نے لنڈن میں — گیا تھا چھوڑ تنہا باغباں گلچین کو گلشن میں
خریدار متاعِ جلوہ "تھا یاں "حسن بے پروا" — بھرے تھے پھول رنگا رنگ آزادی کے دامن میں
تھی مضمر نقابوں میں یہاں عارض کی رنگینی — نہ تھے ناز و ادا پنہاں یہاں روپے کی چلمن میں
نظر آیا یہاں پریوں کا ہم کو جمگھٹا ایسا — لگا دی آگ جس نے صبر اور دانش کے خرمن میں
کبھی گرجا میں جاکر ہم نے جھانکا ماہرویوں کو — کبھی تاکا کیے ہم جاکر کسی گلرو کو گلشن میں
کبھی پہونچے تھیٹر میں تو چھنوا آئے دل اُن سے — ہے جادو جن کی باتوں میں ہے شوخی جنکی چتون میں
کبھی "پکنک" کے جلسے میں ہوئی شامل تو دن بھر — حمائل ہاتھ تھے "شمپین" کی بوتل کی گردن میں
ہمیں گلیوں میں شب کو بارہا یہ مرغِ دل اپنا — نظر آیا کسی گیسوئے زریں کے نشیمن میں
کبھی گھوڑ دوڑ میں جاکر لگائیں بازیاں ہم نے — کہ اس میں جیتنا اور ہارنا داخل ہے فیشن میں

"مٹن چاپ" اور "کٹلٹ" کھا کے ہم ہنستے تھے غوبا پر
مگن رہتی ہیں جو دال اور چپاتی اور سالن میں

پہن کر کوٹ اور پتلون ہوتی تھی ہمیں حیرت
بسر ہوتی ہے کیونکر پاجامے اور اچکن میں

برتے اینڈ تے "وسٹ اینڈ" میں جب جا نکلتے تھے
تو خم آنے نہ دیتا تھا کلف کا لرکا۔ گردن میں

ہماری "ٹائی پن" کے آگے سورج کی کرن یوں تھی
بڑا میلا سا اک تاگا ہو گویا چشمِ سوزن میں

خط آتا تھا جو باوا کا کہ کچھ پڑھتے بھی ہو بیٹا
تو لکھ دیتے تھے ہم "محنت سے خوں بھی خشک ہے تن میں"

نہیں شک اس میں گر سیکھے ہزاروں ہم نے فیشن کے
نہ سیکھا ایک نکتہ بھی مگر قانون کے فن میں

کتابیں بن گئیں گلدستۂ طاقِ فراموشی
ہوئے رہ رہ کے برسوں فیل ہم "اگزیمنیشن" میں

ولایت میں غرض ہم نے اُڑائے ایسے "گلچھرے"
کہ لی جمشید نے حسرت سے کروٹ اپنے مدفن میں

مگر کب تک یہ "گلچھرے"! جو ہوتا گنجِ قاروں بھی
تو ایندھن کے لئے کافی نہ ہوتا ایسے گلخن میں

اُٹھے جب صبح کو اک دن تو جیبوں میں نہ کچھ پایا
ہوئی خالی بھری تھی جس قدر اسٹیم انجن میں

شراب و مطرب و ساقی چھٹے یکلخت سب ہم سے
سکھایا بے زری نے فلسفہ آخر کو لندن میں

ہوئے جب ہمنشیں پرسانِ حال اُن سے کہا ہم نے
"میں دامن ہی نہیں رکھتا جو اُلجھے خار دامن میں"

ظفر

فلکِ اخضری ہے جام مرا

یہ نظم میرزادہ بشیر احمد صاحب کے مضمون "میرا ساغر آسمان ہے" کا منظوم ترجمہ ہے۔ اصل مضمون مخزن ماہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا۔ اُس پر مغز نثر کا یہ دل کش اور رنگین ترجمہ باعث دلچسپی ہوگا:-

لگاؤں گا نہ تجھے منہ میں اوے مے انگور
کہ تو ہے مایۂ فسق و فجور و عُجب و غرور

ہیں وہ نہیں کہ ترا جام پی کے ہوں بدمست
وہ بادہ کش ہوں کہ کہتے ہیں مجھ کو مستِ الست

مری شراب ہی تجھ سے کہیں مصفّا تر
لطیف و خوش مزہ و خوشگوار و زیبا تر

تری شراب سے پرہیزگار ہوں ساقی
کہ مستِ بادۂ جوشِ بہار ہوں ساقی

وہ رند ہوں کہ خُمِ آسماں ہے جام مرا
بلند صوفی و واعظ سے ہے مقام مرا

ایاغِ ساقیِ گردوں جو میرا بھرتا ہے
دماغ عالمِ بالا کی سیر کرتا ہے

ہوں مستِ نشۂ جامِ مظاہرِ قدرت
غضب کے ہوش رُبا ہیں مناظرِ قدرت

پہاڑیوں کی فضائیں ہیں خوشگوار عجب
رواں ہیں کوہ کے دامن میں آبشار عجب

مقام یہ نہیں دیکھے ہیں نیشکر! تونے
کیا نہیں ابھی کہسار کا سفر تونے

یہ دلفریب مقامات چل دکھلاؤں
پہاڑیوں کی ہوائے خنک کھلاؤں

پئیں گے مل کے مئے آفتاب چل تو سہی
عجب بہار ہے۔ گلگشت کو نکل تو سہی

نثار میں ترے او کردگار! قدرت کے
کہ چپّے چپّے پہ جلوے ہیں تری صنعت کے

ازل ہی صانعِ ارض و سما تھی ذات تری
دلیل ہے تری ہستی کی کائنات تری

کہاں تھا میں مری قسمت مجھے کہاں لائی
عدم سے جانبِ ہستی کشاں کشاں لائی

گراں ہے ہجر ترا جانِ ناشکیبا کو
تلاش ہے اسی جلوے کی چشمِ مینا کو

کرے نہ روح مری کیوں تری طرف پرواز
کہ زیست ہی تری قربت میں تفرقہ انداز

میں کاش عمرِ رواں! تجھ کو چھوڑ کر بھاگوں
طلسمِ خانۂ ہستی کو توڑ کر بھاگوں

نگیں جو روح کا خالی مکان دیکھتے ہیں
تو سر اُٹھا کے سوئے آسمان دیکھتے ہیں

کوئی عقاب کی جنگل میں جیسے ہو کودک
نگاہِ یاس سے ہاں دیکھتی ہو سوئے فلک

نجات دے مجھے ان شورشوں سے تو یارب
کہ مجھ کو ہے ترے جلوے کی جستجو یارب

سرور جہان آبادی

نخلستان

صحرائے لق و دق میں ہر اک درختِ خرما — فرشِ زمیں پہ جس نے ڈالا ہے اپنا سایہ!
جو میزباں رہا ہے اکثر مسافروں کا — بیٹھا ہے اُس کے نیچے اک مردِ اجنبی سا
جو اپنا لحن دل کش جنگل کو ہے سُناتا

اے قافلوں کے مسکن۔ اے کارواں کی ملجا — بھولے ہوؤں کے مونس۔ بھٹکے ہوؤں کے ماوا
کھوئے مسافروں نے آرام تجھ سے پایا — سُنتا رہا ہے تیری تعریف کا ترانا
عدنانیوں کے مُنہ سے ہر عہد میں زمانہ

ارضِ عرب پہ تیرے احسان ہیں سراسر — دل کش کیے ہیں تو نے بیت الحرم کے منظر
یثرب کے باغ و صحرا آباد تجھ سے اکثر — بصرے کو شان تجھ سے کوفے کو ناز تجھ پر
سرسبز تجھ سے دائم ہے سرزمینِ بطحا

تعریفی گیت تیرے گایا کیے پرندے — سورج نے بھی سُنے ہیں۔ یہ راگ چھپتے چھپتے
یا اُس نے سر نکالا مشرق میں جب افق سے — اُس نے سُنا ہے اکثر چڑیوں کو یوں چہکتے
اے وُہ جسے نہیں ہے غم موسمِ خزاں کا

گر آسماں کے نیچے تو شاندار تنہا — عظمت دکھاتے اپنی ایسے کھڑا نہ ہوتا
سنسان کیسے ہوتے۔ وادی کوہ و صحرا — پھر کون قافلوں کا مہماں نواز ہوتا
گویا کہ تو سبب ہے جنگل کی آبرو کا

ہے دل میں آرزو یہ پوجوں میں تیری مورت — شاخوں سے تیری ہم کو دکھلا کے اپنی صورت
سکھلائی مسجدوں میں محراب کی ضرورت — ہے پتا پتا تیرا تیغِ دو دم کی صورت
تاجِ زمرّدیں سے ہر سبز نو پیدا

پیغام دے رہا ہے تیرا ہر ایک پتّا — اس تازہ میہماں کو جس کو کہ شوقِ کعبہ
پہنچا گیا ہے تجھ تک اور موت کا فرشتہ — کہتا ہے اس سے آکر۔ ہے قصد اب کدھر کا
چلئے ہیں بُلایا اُس نے کہ جو ہے یکتا

وُہ ہے خطاب کرتا اس نعشِ بیکفن سے — ہے ہے اس آرزو میں نکلا تھا تو وطن سے
اس شوق میں ہی گذرا تو دشت سے چمن سے — تو نے نہ چھوڑی یہ دُھن گو جان نکلی تن سے
بیشک لباسِ کعبہ ماتم ترا کرے گا

نیچے ترے کھڑا ہے اک سُرخ رنگ خیمہ — اِک بے نقاب چہرہ ہے جس میں جلوہ فرما
تو اس سے چپکے چپکے یُوں کہ رہا ہے گویا — اَے قابلِ پرستش دوشیزہ تو نکل آ
تجھ کو یہاں نہیں ہے نامحرموں کا کھٹکا

وُہ مقبرے پہ گنبد جو ہے دکھائی دیتا — خلوتکدہ ہے جو اک مہمانِ دائمی کا
صدیوں سے قبر میں جو پھیلا کے پانو سویا — ڈالا ہے بعدِ مُردن تو نے بھی اُس پہ سایہ
پھولوں کا ہار لاکر شام و سحر چڑھایا

اَے خوشنما پکھیرو۔ اے دلربا پرندو — اک بات پُوچھتا ہوں اس کا جواب تم دو
سنسان جنگلوں میں تم کیوں چہک رہے ہو — آئیگا کون سُننے اس لحنِ دلربا کو
شاید تمہارے نغمے سُنتا ہے نخلِ خرما

محمود شیروانی (از لندن)

تازہ غزلیں

اب بھی جو سال بھر یہ چمن میں نہ آئیگی
عُقبیٰ میں کیا بہار مجھے بخشوائے گی

اَے آہ تو نہ کھول سکیگی درِ قبول
مانا کہ جا کے دیر تلک غُل مچائیگی

راتیں تو اب ہیں عمرِ طبیعی کی بھی اخیر
کیوں اَے شبِ فراق کہاں تک ستائیگی

سُنتے ہیں ضبطِ آہ سے بنتا ہی دل کا کام
اُس کو بھی دیکھ لینگے اگر جی میں آئیگی

مشقِ خرامِ ناز میں یہ موج کیا ضرور
پاپوش سے کسی کی اگر جان جائیگی

بیٹھے بٹھائے دِل میں جو حسرت کو دُوں جگہ
کیا آ کے آرزو کوئی آفت نہ ڈھائیگی

مَیں چاہتا ہوں جب تو ملاتی نہیں ہے آنکھ
ڈھونڈے گی جب تو پھر مجھے دُنیا نہ پائیگی

بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی ہے آرزو کمال
کس شوق سے عدم کی طرف رُوح جائیگی

کیا حسرتِ وصال کی تشویش ناصحا
مَیں خود مُوا ہُوا ہُوں مجھے کیا ستائیگی

فصلِ خزاں میں آنے دو شبنم کو باغ میں
بے اختیار دیر تک آنسو بہائیگی

لے کر چلی ہے ساتھ جو دردو غم و الم
اَے رُوح کس خرابے میں بستی میں جائیگی

یہ کون زندگی ہے کہ مر مر کے ہو بسر
کیا شادؔ سنکھیا نہ مرے ہاتھ آئیگی

(شادؔ)

پابندِ عشق ہو کے جو شوریدہ سر ہوں مَیں
زنداں ہے مجھ کو وسعتِ عالم جدھر ہوں میں

بے نشہ مَیکشوں کی طرح بے خبر ہوں مَیں
کس کی نگاہِ مست کا یارب اثر ہوں میں

فرقت میں شام ہی سے لبوں پر ہے جانِ زار
مالک سحر کو لگی ہے چراغِ سحر ہوں میں

پہلو میں میرے آتے ہی بیچین کیوں ہوئے
کس مُنہ سے کہہ رہے تھے قرارِ جگر ہوں میں

اُلفت بتوں کی دل میں ہے میرے خُدا کی شان
جو پتھروں پہ جم کے اُگا وُہ شجر ہوں میں

دونوں نے مل کے اُس کی گلی میں گرا دیا
ممنونِ لغزشِ قدم و دوریِ سر ہوں میں

(حامد علیخاں بیرسٹر ایٹ لا۔ لکھنؤ)

مجرب اور مفید شرطیہ ادویات نصف سے تک چوتھائی قیمت

ڈاکٹر عبدالنصیر صاحب سند یافتہ میڈیکل کالج لاہور کا تیار کردہ

اصلی نمک سلیمانی

اسکو استعمال سے بقدر بھوک لگتی ہے کرسخت ثقیل جو کچھ کھاؤ فوراً ہضم ہوجاتا ہے۔ درد شکم۔ کھٹی یا جلی ڈکاروں کا آنا۔ اضمہ کو قوت بدن کا گرم ہونا۔ اسہال پیچش۔ درد کمر۔ درد سر ضعف بصر قبض اور سوزش دل وغیرہ تمام امراض کو دفع کرتیں اکثر ثابت ہوا ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے اور خون کی خرابی سے جو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ ان سے نجات دیتا ہے۔ ہیضہ کے لئے تریاق کامل ہے۔ اگر بطور حفظ ماتقدم استعمال کیا جائے۔ تو بھوک زیادہ لگنے کی وجہ سے غذا بڑھتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ آدمی خاصہ پہلوان بنجاتا ہے۔ اصل قیمت فی ڈبیہ دو روپے (عہ)

رعایتی قیمت ۔ آٹھ آنے (۸ر)

جوہر عشبہ

عشبہ سے بڑھکر مصفیٰ خون دوائی دنیا میں کوئی نہیں۔ یہ عشبہ فسادات خون۔ خون اور پھوڑے پھنسی کا مجرب علاج ہے۔ یہ عشبہ خراب خون صاف کرکے خالص خون پیدا کرتا ہے۔

اصل قیمت تین روپے (سے)

رعایتی قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

ممیرے کا سرمہ

یہ سرمہ ضعف بصارت۔ تاریکی چشم دھند۔ جالا۔ پڑوال۔ پھولا۔ سرخی پانی بہنا اور خارش چشم کیلئے شرطیہ مفید ہے۔ طالب علموں اور قانون پیشہ اصحاب یا ایسے اشخاص جنکو آنکھوں سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ وہ اس سرمہ کو بطور حفظ ماتقدم ہر روز استعمال کریں۔

اصل قیمت (سے) رعایتی (۱۲ر)

مونچھیں لمبی اچھی یا چھوٹی

پہلے آپ ایسے شخص کا چہرہ تصور میں لائیں جسکی مونچھیں چھوٹی ہوں پھر اس چہرے پر بڑی مونچھوں کا تصور کرو۔ تو آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ چھوٹی مونچھوں والے مرد کا چہرہ کیسا بدنما اور بیقدر معلوم ہوتا ہے۔ اور بڑی مونچھوں والے شخص کا چہرہ کیسا بارعب اور خوبصورت نظر آتا ہے۔ پس آپ ہمارا تیار کردہ مونچھ بڑھانے کا تیل جلد منگوالیں۔

اصل قیمت فی شیشی دو روپے (عہ)

رعایتی قیمت ۔ آٹھ آنے (۸ر)

بواسیر کی گولیاں

خونی ہو یا بادی۔ مسوں کا درد خون جانا وغیرہ بفضل خدا ایک ہفتہ کے استعمال سے معلوم میں فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ گولیاں بواسیر کے لئے حکمی علاج ہے۔

اصل قیمت دو روپے (عہ)

رعایتی آٹھ آنے (۸ر)

دانتوں کا منجن

دانتوں کی بدبو کو دور کرتا ہے اور دانتوں کے درد سے محفوظ رکھتا ہے۔ دانت خدا کے فضل سے مضبوط ہوجاتے ہیں۔

اصل قیمت فی بکس (عہ)

رعایتی قیمت چار آنے (۴ر)

درخواستیں بنام حکیم ایم الیس پروپرائٹر شفاخانہ آفتاب حکمت لاہور آنی چاہئیں

ممیرہ اور سچے موتیون کا سفید سُرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر کرائیپر صاحب بہادر
ایف۔ سی۔ ایس۔ اے۔ آر۔ ایس۔ ایم۔ فیلو آف کمسٹری لندن

جسکی نسبت لندن و کلکتہ و پنجاب و آگرہ و میڈیکل کالج کے سند یافتہ معزز ڈاکٹرون و نوابون و راجاؤن
کے معزز حکیمون و صاحبان جج بہادر و مجسٹریٹ بہادر و صاحبان ڈپٹی کلکٹران بہادر و معزز یورپین صاحبان
انگریز بہادر وغیرہ نے بعد تجربہ و استعمال کے ہمکو یہ لکھا ہے کہ آپ کا **ممیرہ و سچے موتیون کا سفید**
سُرمہ آنکھونکی بیماریون و ترقی روشنی کیواسطے بہت مفید اور سب سے بہتر و زود اثر دوا ہے۔ کہ جسکے سارٹیفکیٹ
بوقت فرمایش آپ کی خدمت مین ہم خود بھیجینگے ممالک روس وغیرہ کے معزز ڈاکٹران و ہندوستان کے
معزز ڈاکٹران و حکیم آنکھونکی بیماریون مین اور دوا کو چھوڑکر ہماری اس دوا کو استعمال کرتے ہین
ہم نے اصلی و عمدہ ممیرہ بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگوایا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اوسمین جلد کامیابی

نگاہ ناپ کر ہمارا سُرمہ لگائیے دو ہفتے مین روشنی آنکھہ بہت بڑھ جائیگی اور آنکھہ کے جملہ نقص دور ہو جائینگے
(۲) عینک کی ضرورت نہین رہیگی (۳) دُھند۔ ڈھلکہ۔ آنسو بہنا۔ سرخی۔ سوزش۔ کھجلی۔ آنکھہ کے سامنے کا
اندھیرا۔ پلکون کے اندر کے دانے و سُرخی۔ گوہانجی (۱۲) لکھنے پڑھنے سے آنکھون کا تکان۔ درد بہت جلد
بطور خطیہ رفع کرتا ہے (۱۴) کمزور نگاہ سے سوئی مین تاگا بہت جلد چھوڑ لیجیے۔ پروال۔ پھبل۔ جالا۔ پھولی۔
ابتدائی موتیا بند۔ ناخونہ۔ ککرے۔ (۲۲) آنکھونمین سُرخ ڈورے پڑجانے کو (۲۳) پلکین گرجانے والی بیماری کو مفید ہے
(۲۴) کمزور آنکھہ کو قوت دیتا ہے (۲۵) آنکھونکا میل اور مواد صاف کرتا ہے اور جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہے قیمت فی تولہ تین روپیہ (۳) محصول

المشتہر۔ رام سرن نگم۔ کان پور۔

اپنا نام و مقام و نام ڈاک خانہ و ضلع
خوشخط لکھو ورنہ تعمیل نہ ہوگی

چند معزز اور قابل قدر و لائق اطمینان شہادتین

(۱) عالیجناب ڈاکٹر اے وائی روٹر صاحب بہادر آر ڈی۔ ایم۔ پی۔ ایل۔ لندن۔
(۲) جناب ڈاکٹر ایچ پی۔ بنرجی صاحب۔ ایل ایم۔ ایس۔ و سرجن کلکتہ
(۳) جناب ڈاکٹر ای۔ این بنرجی صاحب ایل۔ ایم۔ ایس۔ و سسٹنٹ سرجن میرٹھ۔
(۴) جناب ڈاکٹر الہ یار خان صاحب ایل۔ ایس۔ جی۔ سی۔ ہاسپیٹل اسسٹنٹ ضلع بجنور
(۵) جناب ڈاکٹر عبدالصمد خان صاحب ہاسپیٹل اسسٹنٹ ضلع کانپور
(۶) عالیجناب شمس العلماء خان بہادر جناب مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب پروفیسر سابق میور کالج الہ آباد
(۷) عالیجناب مولوی معین الدین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر و اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بندوبست کانپور
(۸) عالیجناب میر حمزہ حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل۔ سب جج بہادر مقام منگلور۔
(۹) عالیجناب مولوی سید حامد حسین صاحب منصف درجہ اول ضلع ہمیر پور۔
(۱۰) عالیجناب منشی [illegible] لال صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ضلع [illegible]
(۱۱) عالیجناب مسٹر بہاری صاحب مکرجی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایل۔ سشن جج بہادر گونڈا۔
(۱۲) عالیجناب مسٹر [illegible] صاحب رائے صاحب بی۔ ایل۔ جج خفیفہ بہادر کان پور۔
(۱۳) عالیجناب مسٹر شنکر لال صاحب سٹی مجسٹریٹ بہادر مقام [illegible]
(۱۴) عالیجناب مسٹر جی ڈاربی صاحب بہادر لوکو [illegible] نارتھ ویسٹ [illegible] کان پور۔
(۱۵) عالیجناب جی۔ [illegible] صاحب بہادر انجنیر ریلوے۔

المشتہر۔ رام سرن نگم۔ کان پور۔